MASIHI ZINDAGI MEN INJIL KA TAJRIBA

( Urdu translation of The Gospel in Experience )

by the Rev. K. D. W. Anand

1954


کتاب ملنے کا پتہ

ایس، پی، سی، کے

پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۵، کشمیری گیٹ، دہلی ۶

Printed at

Dayals' Printing Press - Delhi




# فہرست مضامین

# اس کتاب کو کیسے پڑھنا چاہیئے؟

گمان غالب ہے کہ ناظرین کے پاس کتابِ مقدّس اور کلید الکتاب کے سوا کوئی اور کتاب نہ ہوگی۔ لیکن اگر دستیاب ہوسکے تو" بائبل کو مطالعہ کرنے کا طریقہ" اور اسی قسم کی دیگر امدادی کتب دورانِ مطالعہ میں مفید ثابت ہوں گی۔ بائبل کی ڈکشنری اور کتابِ مقدّس کے بعض صحائف کی تفسیریں بھی ممد ومعاون ثابت ہوسکتی ہیں۔

دینیات کے مطالعہ میں گیان دھیان اور استغراق نہایت ضروری لازمہ ہے۔ اسی لحاظ سے ہر باب کے شروع میں حسبِ موقعہ ایک پارہ درج کیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کا ناظر اپنے مطالعہ کے موضوع اور خیالات کو برابر دعا میں منتقل کرتا رہے تو نہایت مناسب ہوگا۔

اگر ناظر کو اوّل بار اس موضوع سے واسطہ پڑا ہے تو اس کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ ابواب دوم تا چہارم کے مطالعہ کو اخیر کے لئے اٹھا رکھے، کیونکہ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ابواب زیادہ دقیق ہیں۔ لیکن ترتیب کے لحاظ سے انکی یہی جگہ انسب تھی۔

ناظرین کو صلاح دی جاتی ہے کہ جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، یا جو کچھ اُن کے ذاتی تجربے میں اور دوسروں کی زندگی میں پیش آچکا ہے اُس کو اچھی طرح جانچیں اور پرکھیں۔ اس سلسلے میں بعض سوانح عمریوں یا حکایت وافسانہ

کی اُن کتابوں میں جو مطالعہ میں آچکی ہیں، ایسے مواقع مل سکتے ہیں جن پر اُن
خیالات کا عمدگی سے اطلاق ہو سکتا ہے۔

---

# باب اوّل

## تمہید

اے خداوند میں تجھ پر اعتقاد رکھتا ہوں، میری بے اعتقادی میں میری مدد کر۔
میں تجھ سے محبّت رکھتا ہوں۔ تاہم پورے دل سے نہیں جس کا میں
مشتاق ہوں۔

مجھے تیری بے حد تمنّا ہے، لیکن اپنی ساری طاقت سے نہیں۔ میں تجھ پر
اعتماد رکھتا ہوں، پر اپنی ساری عقل سے نہیں۔ میرا ایمان، میری محبّت،
تجھے جاننے اور تیری خدمت کرنے کی۔

میری بے حد تمنّا اور تیری قوّت کا بھروسہ کہ وہ مجھے محفوظ رکھ سکتی
ہے، قبول فرما۔

میری افسردگی کو آتش جوش میں بدل دے۔ میری کمی کو پورا کر۔
میں تیری برکت کا منتظر ہوں۔ ہمارے خداوند یسوع مسیح کے
وسیلے سے۔

(آداب پرستش)

انسان کی ایک نہایت بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سوچنے کی
قوّت رکھتا ہے۔ وہ اُن چیزوں کو جو اُس کے چاروں طرف ہیں اور اپنے

تجربے کے مطلب کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں لوگ قیاس سے کام لیتے تھے اور کہانیوں کے ذریعے اپنے بیانات پیش کرتے تھے۔ ہر جگہ ہم فرضی قصے اور عوام کی روائتیں پاتے ہیں۔ جو مظاہرِ فطرت کی توجیہ کرتی ہیں۔ مثلاً بادل کیوں گرجتا ہے۔ یا جلانے والی چیزیں کس طرح پیدا ہوئیں۔ یا بدکاری دنیا میں کیوں کر شروع ہوئی۔ (پنڈورا کا صندوق) اُس ابتدائی دور میں بھی لوگ واقعات کی حقیقت کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر چکے تھے۔ لیکن در اصل یہ بیانات قابلِ اطمینان نہیں تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ یہ کہانیاں زیادہ پُر احتیاط اور صحیح بیانات کے لئے جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ اور ہمیں سائنس، تواریخ اور دینیات کے شروعات نظر آنے لگتے ہیں۔ مسیحی عقیدے کا آغاز بھی اسی طرح ان معلومات سے ہوا۔ جو عام مسیحیوں کی زندگی کے حالات سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور ہم ان معلومات کو جمع کر کے ان کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسیحی عقیدے کی تحقیق میں ہم اپنے اُس تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو خدا اور یسوع مسیح اور اپنی ذاتی زندگی کے بابت ہمیں حاصل ہے۔ ہم اس تجربے کا مطلب معلوم کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہ خدا کیوں مخصوص طریقوں سے کام کرتا ہے۔ جیسے جیسے ہم اس بات کو زیادہ سمجھتے جاتے ہیں۔ ہماری زندگی خدا میں ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور ہم دوسروں کی اُن دشواریوں میں جنھیں وہ الہٰی اطمینان و طاقت حاصل کرنے میں محسوس کرتے ہیں زیادہ مدد پہنچا سکتے ہیں۔

پس اگر ہم مسیحی عقیدے کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم اپنے مسیحی تجربے کو حاصل کریں۔ جس شخص نے اب تک یہ نہ جانا ہو کہ مسیح میں خدا اس پر ظاہر ہوا۔ وہ ہمارے عقیدے کو پورے طور پر سمجھنے میں قاصر رہے گا۔ یہ اُن وجوہات میں سے ایک ہے۔ جن سے لوگ مسیحی عقیدے کی نسبت گفتگو کرنے میں غلطیاں



کرتے ہیں جس قدر ہم خدا کی مرضی پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی قدر اس کے عقیدہ کو سمجھنے کے قابل بنتے ہیں۔ تجربہ پہلے ہونا چاہیئے اور ہمارا عقیدہ اس تجربہ کو سمجھنے کی محض ایک کوشش ہے۔ اکثر ہماری تشریح کوتاہ بلکہ غلط ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے ہمارے تجربے کی حقیقت رد نہیں ہو سکتی۔ پس اگر ہم کو ایسی تعلیم دی جائے جو ہمارے ذاتی تجربے کے خلاف ہو تو وہ یقیناً غلط ہوگی۔ حالانکہ شاید ہم یہ نہ بتا سکیں کہ اس کے غلط ہونے کا سبب کیا ہے۔

چونکہ ہم اپنے ہی تجربے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کے بیانات اگر ہمارے بیانات سے متفرق ہیں تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اُن کا تجربہ متفرق ہے اور اُن کا مزاج بھی متفرق ہے۔ اس لئے اگر ہر شخص تمام چیزیں ایک ہی طریقے سے نہیں سمجھتا تو یہ حیرت انگیز بات نہیں۔ ہمیں یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ وہ سچائی کے دشمن ہیں، بلکہ یہ کہ وہ ہمیں کچھ اور سکھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کا تجربہ متفرق ہے۔ شاید وہ بعض باتیں زیادہ صفائی سے دیکھ سکتے ہیں اور ان کے بیانات ہماری غلطیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں، اور ہم یہ اُمید رکھ سکتے ہیں کہ ہم بھی اُنھیں کچھ دے سکتے ہیں جسے وہ بصورتِ دیگر حاصل نہیں کر سکتے۔

بہرحال دوسروں کی طرف ہمارا طرزِ خیال بلا تعصّب اور کشادہ ہونا چاہیئے۔ ہمیں اُس متضاد غلطی سے ہوشیار رہنا چاہیئے جس سے ہم یہ سوچنے لگیں کہ انسان کے اعتقادات کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ بالآخر صحیح تصورات ہی نیک زندگی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور غلط تصورات غلط زندگی کی۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ گزشتہ زمانے میں کچھ اساتذہ پر بدعت کا فتویٰ اس لئے لگایا گیا کہ ان کی تعلیم (ارشادات) سے مسیحی مذہب کو نقصان پہنچنے کا یقیناً اندیشہ تھا۔ حالانکہ وہ اس خطرے کو خود محسوس نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح فی زمانہ بھی کئی غلط تصورات پائے جاتے ہیں۔

جو ہمارے مذہب کے لئے نقصان کا باعث ہیں۔ لیکن ہم کو ہمیشہ سچائی کی تلاش میں کوشاں رہنا چاہیئے اور حتی الامکان سچائی کو قائم رکھنا چاہیئے۔ گزشتہ زمانے میں سچائی کو قائم رکھنے کے لئے مسیحیوں کے درمیان ایسے جھگڑے ہو چکے ہیں جو نہایت افسوسناک ہیں۔ تاہم ان جھگڑوں کی پشت پر نہایت اہم مسائل تھے۔ جن کے سبب اب تک مسیحیوں کے درمیان نااتفاقی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کا فیصلہ باہمی جھگڑوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ہر فرد انھیں صرف اپنے ذاتی تجربے کی کسوٹی پر جانچ سکتا ہے۔

لیکن اپنے تجربے کو سمجھنا اور اس کی تشریح کرنا آسان کام نہیں، کیونکہ اکثر لوگ اس کوشش میں غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ لوگ بعض اوقات سُستی کی وجہ سے اور اکثر اس خوف سے کہ غلطی میں نہ پھنسیں یہ پسند کرتے ہیں کہ انھیں وہ تمام باتیں بتا دی جائیں جن پر انھیں ایمان لانا چاہیئے تاکہ ان کو خود غور و فکر کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی اُستاد نہیں پایا جاتا جو اس طرح ہماری ہدایت کر سکتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں لوگ کہا کرتے تھے کہ کلیسیا اس امر میں ہدایت کر سکتی ہے۔ بلکہ موجودہ زمانے میں بھی کچھ لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ کلیسیا ہے کیا چیز؟ یا کلیسیا کی تعلیم کیا ہے؟ تو ہمیں کوئی جواب نہیں ملتا۔ اور ہم ہنوز اپنے اعتقادات کی بابت شک و شبہ میں رہ جاتے ہیں۔ کلیسیائی اصلاح (رفارمیشن) کے بعد بہت لوگوں نے کتابِ مقدس کو کلیسیا کی جگہ دینے کی کوشش کی اور کہا کہ کتابِ مقدس ہی ایک کامل سند ہے۔ لیکن جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی خاص مسئلہ پر کتابِ مقدس کی کیا تعلیم ہے تو ہمیں مختلف بیانات نظر آتے ہیں۔ اور یہ نظریہ صرف اسی حالت میں صحیح مانا جا سکتا ہے کہ کتابِ مقدس کا کوئی مستند ترجمان موجود ہو۔ اس سلسلے میں یہ نہایت قابلِ غور بات ہے کہ ہمارے خداوند اور اُس کے رسولوں نے کسی چیز کو مستند ٹھہرانے سے احتراز



کیا اور اگر ہم کسی چیز کو مستند قرار دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ہم جلد معلوم کر لیتے ہیں کہ جس امر میں اسے ہماری مدد کرنی چاہیئے وہ ہماری مدد نہیں کر سکتی۔

لیکن خدا نے ہم کو عقل کی صلاحیت عطا کی ہے تاکہ ہم اس کی مدد سے سچائی کو ڈھونڈھیں اور اس کی جانچ کریں، اور دراصل عقل ہی کے ذریعے ہم سچائی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل ناقص ہو۔ تاہم اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی آلہ نہیں۔ جیسے کہ حسنِ موسیقی کی جانچ کے لئے قوتِ سامعہ کے سوا ہمارے پاس اور کوئی آلہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہمارے کان سننے سے عاری ہیں تو ہم آوازوں کی خوبصورتی کو نہیں پہچان سکتے۔ بہر حال ہمارے تمام قوٰی کی ریاضت ہو سکتی ہے۔ ہماری قوتِ سامعہ کی ریاضت ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم اُن آوازوں کو سُن سکیں جو پہلے نہیں سُن سکتے تھے، اور اُن چیزوں کی قدر کر سکیں جن کی ہم پہلے قدر نہیں کر سکتے تھے۔ اس ریاضت کا پہلا اصول یہ ہے کہ ایسے اُستاد کی اطاعت اختیار کی جائے جو ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ کس قسم کی آوازیں سننا ضروری ہیں۔ اسی طرح ہماری عقل کو بھی ریاضت کی ضرورت ہے، جس کے لئے کتابِ مقدس، کلیسیا اور دینی معلموں کی اطاعت لازمی ہے، جن سے ہمیں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ ان کی مدد سے ہم عقل کو استعمال کرنے کی دقت سے بچ سکتے ہیں، درست نہیں۔

بہر کیف، ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ اعتراض کرے کہ مسیحی کو عقل کے بجائے ایمان سے کام لینا چاہیئے اس لئے کہ مسیحی مذہب اولاً ایمان پر قائم ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے۔ لیکن ایمان عقل کے خلاف نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو ہم اس طرح ثابت نہیں کر سکتے جس طرح پہاڑے کی صحت ثابت

ہو سکتی ہے۔ لیکن ایمان ہم کو عقل کے دائرے سے باہر لے چلتا ہے۔ حالانکہ اس پیش قدمی میں عقل سے کام لینا لازمی ہے۔ اسی طریقے سے علم بتدریج ترقی ہوتی ہے۔ سائنس والا اپنے مشاہدے کے لازمی سبب کا یقین کرتا ہے، اور اس یقین پر عمل کرتے ہوئے اپنے مشاہدے کی علت کو حق بجانب ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی کے سفر کا آغاز ایمان سے ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سفر میں ہمیں عقل سے ہمیشہ کام لیتے رہنا چاہیئے تاکہ ہم غلطی اور خطرے سے محفوظ رہیں۔ ایمان درحقیقت ایسی روشنی ہے جس سے عقل بصارت حاصل کرتی ہے۔

لوگ جب عقل سے کام لئے بغیر ایسی باتیں تسلیم کر لیتے ہیں جو انھیں تحکماً بتائی جاتی ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی اوہام پرستی اختیار کر لیتے ہیں۔ رہبت پرستوں کا توہم اسی قسم کی تحکمانہ تعلیم پر مبنی ہے، اور جو شخص ایسی تعلیم کا شنوا ہوتا ہے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جو کچھ اُس کو بتایا جاتا ہے اُس پر ایراد و اعتراض کے بغیر ایمان لے آئے۔ لیکن ایسا رویہ ایک مسیحی کا نہیں ہو سکتا جو خدائے حق کا معتقد ہے۔ ہمیں مکمل تحقیق سے ہرگز نہیں گھبرانا چاہیئے۔ اگر ہم خدا کی نسبت زیادہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہم یقین رکھیں کہ ہر سچائی اس جستجو میں ہماری مدد کرے گی۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوں۔ لیکن یہ غلطیاں یوں درست کی جا سکتی ہیں کہ ہم سچائی کی نسبت اور زیادہ واقفیت حاصل کریں۔ سوالات پوچھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے بیانات میں کیا کیا خامیاں ہیں، اور یوں ہمارے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم مکمل علم رکھتے ہیں اور تحقیقات سے درگزر کریں تو ہمارا دائرہ علم محدود رہ جائے گا۔ اپنی دشواریوں کا مقابلہ نہ کرنا اور ان کو دور کرنے کی کوشش نہ کرنا، خدا پر ہماری بے اعتقادی کا نشان ہوگا۔ ہماری دشواریوں کا مخلصانہ



جواب جو تمام سچائیوں کا جائزہ لیتا ہے ہمارے ایمان کو مستحکم کرتا ہے، ورنہ ہمارا ایمان بے مصرف ہے، جس کا نہ ہونا ہمارے لئے بہتر ہے۔

پس اپنے مذہب کو سمجھنے کے لئے ہم کتاب مقدس کی تعلیم سے کام لیں گے، اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ پہلے شاگردوں کا کیا ایمان تھا، اور یہ بھی کہ ہمارے خداوند نے کیا کیا سکھایا۔ علاوہ ازیں اس وقت سے جتنے حقیقی مسیحی ہوئے ہیں ان کے تجربہ یعنی کلیسیا کے تجربے کو کام میں لائیں گے، اس سلسلہ میں ہم یہ دیکھیں گے کہ دوسروں نے مسیحیت کو سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں اور ہم کو ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ جب کبھی زبردست غلطیاں ظہور میں آئیں تو بعض مسیحیوں نے صحیح راستہ دکھایا اور یہی ہمارے عقائد کا خاص مقصد ہے۔ بالآخر ان سب باتوں کی میزان لگا کر ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے عقیدے کا کیا مقصد ہے۔

اس قسم کے مطالعے میں ایک دشواری یہ ہے کہ مسیحی تفکر ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہر حصّہ دوسرے حصّے پر منحصر ہے۔ یہ علم الحساب کی طرح نہیں جس میں ایک عمل دوسرے عمل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور یوں بالترتیب سیکھا جا سکتا ہے، لیکن ہم ایسی تعلیم جو خدا کی نسبت ہے اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ انسان، گناہ اور کلیسیا کے مطلب کو نہ سمجھ لے۔ لہٰذا وہ باتیں جن کی تشریح اس کتاب کی بعد میں آنے والی فصلوں میں پیش کی گئی ہے اُن کو ابتدائی فصلوں میں تسلیم کر لینا ضروری ہوگا۔ اس وجہ سے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے دینی مسائل کے مجموعے کا اگر ایک حصّہ بھی مسترد کر دیا جائے تو دوسرے حصّوں پر اس کا نتیجہ نہایت بُرا ہوگا۔ اس لئے ہمیں ہر موقعے پر کل مجموعے کا خیال رکھنا

لازمی ہے۔

اکثر ہم کو دو حقیقتیں نظر آئیں گی جنھیں مدنظر رکھنا ضروری ہوگا، چاہے وہ ناقص معلوم ہوتی ہوں۔ گزشتہ زمانے میں اور موجودہ زمانے میں بھی اکثر غلطیوں کا سبب یہی تھا کہ دو سچائیوں میں سے صرف ایک پر زیادہ زور دیا گیا۔ بہرحال دونوں کو خیال میں رکھنا ضروری تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھ سکیں کہ دونوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس زندگی میں تو یہ بالکل ناممکن ہے، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ہم اس بھید کو پورے طور پر سمجھیں۔ لیکن جو بات واقعی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم کسی حقیقت کو نظر انداز نہ کریں۔

جب ہم ان حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو خدا سے اور ہم سے متعلق ہیں تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسے موزوں الفاظ نہیں جن کے ذریعے یہ خیالات درستی سے ادا کئے جائیں۔ اس لئے ہمیں تشبیہات سے کام لینا پڑتا ہے جو حقیقت سے ملتی جلتی تو ضرور ہیں لیکن ان کے ذریعے مکمل حقیقت کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی آنکھیں راستبازی پر ہیں۔ لیکن خدا مادی آنکھیں نہیں رکھتا اور نہ صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی چیز کے اوپر ہے۔ کیونکہ خدا کی ذات میں مکان کی بندش نہیں پائی جا سکتی۔ اکثر کتاب مقدس میں بلکہ دیگر مسیحی کتابوں میں بھی تشبیہی طرز بیان استعمال میں آیا ہے۔ اس لئے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں تشبیہ کے ناجائز استعمال سے ہوشیار رہنا چاہئے جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ کسی ان جانے خطۂ زمین کی نسبت معلومات حاصل کرنے کے لئے نقشہ کارآمد چیز ہے۔ لیکن اس کا صحیح استعمال



لازمی ہے۔ مثلاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ شہروں کو نقشہ پر گول نقطہ کے ذریعے دکھایا جاتا ہے لہٰذا ہر شہر گول ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ مذہبی اصطلاح میں بھی تمثیلی علامتوں کی تشریح صحیح ہونی چاہیئے ورنہ اس میں بھی اسی قسم کی حماقت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

آخر میں ہم یاد رکھیں کہ مسیحیت ایک راہِ زندگی ہے، ایک طرزِ معاشرت ہے، محض زندگی کا نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک معمولی سے معمولی معتقد مسیحی زندگی کو بآسانی اختیار کر سکتا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دانش مند اور عالم شخص اس سے محروم رہ جائے۔ ہمارا ایمان اس زندگی کے سمجھنے میں ضرور ہماری مدد کر سکتا ہے، ورنہ ہمارا ایمان بے کار ہے۔ مسیح کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ ہم اس کے بارے میں جانیں۔ بلکہ یہ کہ خدا کو جانیں۔ اور مسیحی مذہب کا مقصد نہ صرف یہ ہے کہ خدا کی ذات کو سمجھیں بلکہ یہ کہ اس کی پرستش کریں۔

# باب دوم

## زندہ خدا

اے خدا تو میرا خدا ہے۔
میں دل سے تیرا طالب ہوں گا۔
میری جان تیری پیاسی ہے۔
میرا جسم تیرا مشتاق ہے۔
خشک اور پیاسی زمین میں جہاں پانی نہیں،
تیری شفقت زندگی سے بہتر ہے۔
اس لئے کہ تو میرا مددگار رہا ہے،
اور میں تیرے پروں کے سائے میں خوشی مناؤں گا۔
میری جان کو تیری ہی دُھن ہے۔
تیرا داہنا ہاتھ مجھے سنبھالتا ہے۔

(زبور ۶۳)

"خُدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ ۔ ۔ ۔ اور خُدا نے سب پر جو اُس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے۔" (پیدا: ۱، ۳۱) یہ مسیحی مکاشفہ کا شروع ہے۔ اور مسیحی مذہب کی نسبت ہمارے خیالات کا اعلیٰ ترین چشمہ ہے۔





لوگوں نے اکثر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ثبوت فیصلہ کُن نہیں۔ شاید وہ ہمیں اس خیال تک پہنچا سکیں کہ خدا کا وجود ممکن ہے۔ لیکن بالآخر خدا پر ایمان لانا اعتقاد کا فعل ہے۔ ایسا اعتقاد کہ جب ہم اس کے مطابق عمل کریں تو ہمارا تجربہ اس کی تائید کرے۔

اہلِ یہود جیسے جیسے مذہبی تصوّرات میں ترقی کرتے گئے۔ انھوں نے معلوم کیا کہ دراصل خدا صرف ایک ہو سکتا ہے، اور جو قومیں کئی دیوتاؤں کو مانتی ہیں ان کے پاس کوئی حقیقی خدا نہیں۔ اسی طرح یونان کے سب سے اعلیٰ مفکّرین نے معلوم کیا کہ اگر ہم دنیا میں کوئی معقول مقصد اور طریقِ کار دیکھنا چاہتے ہیں تو صرف ایک خدا ہونا چاہیئے۔ ہماری عقل اور ہمارے مذہب دونوں کے لئے ضروری ہے کہ ہم صرف ایک خدا کو مانیں۔ بہرحال عملی طور پر اس بنیادی نظریے سے بھٹک جانے کی آزمائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات شیطان کو عنقریب دوسرا خدا مان لیا جاتا ہے۔ گویا کہ وہ بھی قادرِ مطلق ہے۔ لیکن ہمیں اپنے عقیدے کے پہلے رکن پر یعنی "میں اعتقاد رکھتا ہوں ایک خُدا پر" ثابت قدم رہنا چاہیئے۔

اگر ہماری مذہبی ضروریات پوری ہوتی ہیں تو ہم کو خدا کے بارے میں اور زیادہ علم حاصل کرنا لازم ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہو چکے ہیں جن کا یہ قول تھا کہ خدا اس قدر اعلیٰ و برتر ہے، اور انسان سے اس قدر ممیّز ہے کہ ہم نہ تو اس کو جان سکتے ہیں اور نہ اس کی بابت کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ہم خدا کو محض ایک اعلیٰ اور طاقتور انسان سمجھ لیں اور اس کو اپنے خیالات سے محدود کرنے کی کوشش کریں تو اس میں خطرہ ہوگا۔ بہرحال ہم اس کی ذات کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ ہم اس کی بابت تھوڑا بہت علم ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ جو کہ نامکمّل ہونے کے باوجود کسی حد تک صحیح ہوگا۔ علاوہ ازیں اگرچہ انسانی عقل

کے ذریعے سے خدا تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی۔ تاہم وہ اپنے آپ کو ہم پر یقیناً ظاہر
کرسکتا ہے۔ مسیحی زندگی کے تجربے میں اور خصوصاً خود یسوع مسیح کی زندگی میں ہم دیکھتے
ہیں کہ خدا اپنی ذات کو انسان پر ظاہر کرسکتا ہے۔

وجود کی اعلیٰ ترین صورت جس سے ہم واقف ہیں شخصیت ہے۔ یہی انسان کو حیوانات
سے ممیز کرتی ہے اور اُسے اشرف المخلوقات کا مرتبہ دیتی ہے۔ اور چونکہ انسان خدا
کی صورت پر بنایا گیا ہے اس لئے خدا کی نسبت ہم کم ازکم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا ایک
شخصی ہستی ہے۔ یہ ہمارے اس اعتقاد کے مطابق ہے کہ خدا کا اعلیٰ ترین مکاشفہ
انسانی شخصیت میں اور اس کے ذریعے سے ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی شخصیت
ہماری شخصیت سے اعلیٰ ہے۔ تاہم وہ ایک شخصی ہستی ضرور ہے۔ اور تثلیث کا مسیحی مسئلہ
خدا کی شخصیت کو محض ہماری شخصیت کے مانند سمجھنے کی غلطی سے محفوظ رکھتا ہے۔ پس خدا
کی نسبت یہ ماننا کہ وہ ایک شخصی ہستی ہے یعنی وہ ذی حیات، العاقل، ذی ارادہ، الخالق
اور الودود ہے مسیحی عقیدے کا ایک بنیادی رکن ہے۔

خدا کی ذات کا ابتدائی مکاشفہ کائنات میں پایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ دنیا کے
دُکھ اور درد اور بُرائی سے گھبرا جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں ایک مہربان خدا کی
طرف سے نہیں ہوسکتیں، اور بعض اوقات وہ یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کو کسی خدا سے کمتر
قوت نے بلکہ کسی بُرے معبود نے بنایا ہوگا۔ اور اکثر اوقات لوگوں نے یہ بھی کہا ہے
کہ یہ مادی دنیا اور ہمارے جسم بذاتِ خود باطل ہیں اور ہمارے لئے سب سے بہتر
علاج یہ ہے کہ ہم دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنی روحوں کو
جسم کی خواہشات سے رہا کریں۔ بلکہ ہم مسیحیوں کو بھی بعض اوقات ایسی باتیں کرتے
سنتے ہیں۔ بہرکیف کتابِ مقدس یوں شروع ہوتی ہے کہ خدا نے دنیا کو پیدا کیا اور
اس نے دیکھا کہ سب کچھ بہت اچھا ہے۔ اس دنیا میں ہم کو جو زندگی بخشی گئی ہے وہ



بجائے خود اچھی ہے، اور اگرچہ اور اچھی چیزوں کی طرح اس کا بے جا استعمال
کیا جاسکتا ہے، تاہم وہ خدا کے مقصد کو تکمیل دینے کا مناسب ذریعہ ہے۔
یہ نظریہ دشواریاں ضرور پیش کرتا ہے اور جو سوالات لازمی طور پر ہمارے
دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اُن کو حل کرنا آسان نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کا
حل کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ماننا کہ یہ دنیا اچھی ہے اور خدا کے
مقصد کو انجام دینے کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہے، ہمارے طرزِ زندگی اور خدا کی
نسبت ہمارے تصورات میں اور بھی زیادہ فرق پیدا کردیتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور قسم کی دشواری پیش آتی ہے۔ لوگ یہ خیال کرتے
تھے کہ خدا نے فقط چھ دن میں دنیا کو پیدا کیا۔ مگر اب سائنسدان ہمیں یہ
بتاتے ہیں کہ دنیا کروڑہا سال سے موجود ہے، اور اُن میں سے زیادہ تر یہ
بھی کہتے ہیں کہ انسان نے رفتہ رفتہ زندگی کی ادنیٰ حالتوں سے ترقی کرکے
موجودہ شکل اختیار کی۔ یہ سب بیانات صحیح ہوسکتے ہیں، اور ہم مسیحی ہونے
کی حیثیت سے کسی نظریے کی جو صرف سائنس پر مبنی ہے تائید یا تردید نہیں کرسکتے،
کیونکہ یہ صرف ایک اچھے سائنسدان کا شرف ہے۔ لیکن اگرچہ سائنس کے
ذریعے سے کافی حد تک یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ خدا پہلے کس طرح کام کرتا
تھا اور اب کس طرح کر رہا ہے، تاہم سائنس ہم کو یہ نہیں بتا سکتی کہ خدا کسی
خاص طریق عمل کو کیوں اختیار کرتا ہے یا اس کے طرزِ عمل کا مقصد کیا ہے۔
اور مسیحی کے لئے یہی سب سے اہم بات ہے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ سائنس ہمیں
زندگی کا مطلب سمجھائے، وہ خود الٰہی مکاشفہ کی محتاج ہے۔ بہرحال بہت سے
مسیحیوں کا یہ خیال ہے کہ مسئلہ ارتقا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانی
زندگی میں الٰہی مقصد پایا جاتا ہے اور اسی نظریے سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا

کہ الٰہی مقاصد کے پورا ہونے میں اس قدر تاخیر کی کیا وجہ ہے۔

ایک فقرہ جو ہم ہمیشہ عقیدوں اور دعاؤں میں استعمال کرتے ہیں "قادر مطلق" ہے۔ ابتدائی مسیحی اس سے بہتر ایک یونانی لفظ (Pantocrator) "پنٹوکریٹر" استعمال کرتے تھے جس کے معنی ہیں "حاکم کُل"۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو فطری طور پر غیر ممکن ہیں۔ مثلاً خدا علم الحساب کے قاعدوں کو بدل نہیں سکتا۔ نیز وہ اپنی مرضی اور ذات کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا، مثلاً وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ پس جب ہم کہتے ہیں کہ وہ قادرِ مطلق ہے تو اس سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ وہ سب چیزوں پر اختیار رکھتا ہے اور کوئی بات اس کے حکم کے بغیر واقع نہیں ہو سکتی، اور کوئی چیز اس کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ جس طرح ہمارے لیئے یہ ماننا ضروری ہے کہ خدا نے دنیا کو بنایا، اسی طرح ہمارے لئے یہ ماننا اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ اُس پر قابض بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور معنی میں خدا کی قدرت محدود ہے جس کا ذکر بہت مرتبہ ہمارے مطالعے میں ملے گا۔ خدا نے بعض ہستیاں ایسی خلق کی ہیں جو قوتِ ارادی رکھتی ہیں جن میں انسان بھی شامل ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں صرف خدا ہی کی مرضی کام نہیں کرتی بلکہ جب یہ خود مختار ہستیاں اس کی مخالفت کرتی ہیں، تو اس کی مرضی محدود ہو جاتی ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم اس کے مقاصد کو بالآخر پورا ہونے سے روک سکتے ہیں، یا ہم اس کے قبضے سے باہر نکل سکتے ہیں، بلکہ یہ کہ ہم خدا کے طریقِ عمل میں یا جن ذریعوں اور وسیلوں کو وہ استعمال کرتا ہے ان میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔

خدا کی ذات کو واضح کرنے کے دو طریقے ہیں جن کو ہمیں اچھی طرح



سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اُن کے ذریعے سے ہم خدا کی ذات کو سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی خدا کائنات سے ماوراء اور محیطِ کل ہے۔ اولاً خدا کائنات سے ماوراء ہے۔ وہ دنیا سے برتر یعنی اس سے باہر ہے جس طرح کہ ایک بڑھئی اپنی بنائی ہوئی چیز سے باہر اور برتر ہوتا ہے۔ خدا کی ذات میں کوئی ایسی کمی نہیں جسے پورا کرنے کے لئے وہ دنیا کا محتاج ہو۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہے۔ دوسری جانب خدا محیطِ کل ہے۔ یعنی وہ کائنات میں موجود ہے۔ جس طرح کہ ایک مصنف کے خیالات اس کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں اور جب تک ان کا اظہار اس پیرائے میں نہ ہو نامکمّل رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح سب چیزیں خدا میں ہیں اور اسی سے وہ وجود پاتی ہیں اور اسی میں ان کا وجود قائم رہتا ہے۔ بعض مرتبہ لوگوں نے صرف اس کی بالاتری کو دھیان میں رکھا ہے اور اس کی نسبت یہ خیال کیا کہ اس نے دُنیا کو بنا کر چھوڑ دیا اور صرف وقتاً فوقتاً کسی چیز کو درست کرنے کے لئے معجزانہ طریقے سے اس میں مداخلت کرتا ہے۔ جیسے کہ ایک شخص گھڑی میں چابی بھر کر چھوڑ دیتا ہے۔ اور شائد گاہے ماہے اس کی سوئیوں کو آگے پیچھے کر دیتا ہے۔ لیکن یہ خیال خدا کو ہم سے اس قدر دور کر دیتا ہے کہ ہم اس کے اور اپنے درمیان ایک قسم کے وسیلے کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں اور مذہب کا شخصی اثر جاتا رہتا ہے۔ اوروں نے صرف اُس کے کائنات میں موجود ہونے کو دھیان میں رکھا ہے۔ ان کی نظر میں ہر چیز خدا کا جُزو ہے، چاہے وہ اچھّی ہو یا بُری۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جس سے دنیا کی اخلاقی زندگی زائل ہو جاتی ہے۔ اور خدا محض کائنات کی جان بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے دونوں پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے۔ خدا اعجازی یا غیر معمولی چیزوں اُد

روزمرہ کے بدستور واقعات دونوں میں ایک ہی طرح کام کرتا اور اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس دنیا سے برتر و بالا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس دنیا اور کل کائنات میں موجود بھی ہے۔

خدا کی بابت مسیحی تفکرات کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ "خدا محبّت ہے" (۱۔یوحنا ۴: ۸)۔ ذاتِ الٰہی کی دیگر کیفیّتیں اس کی محبّت کے مختلف پہلو ہیں۔ اُس کا رحم اور اس کا غضب یکساں، اس کی محبّت کے مظاہرے ہیں۔ یہ اعتقاد صرف اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ہم مسیح میں خدا کا مظہرِ کامل دیکھتے ہیں۔ مسیح نے ہم سے ہمیشہ یہ کہا کہ تم "خدا کو اپنا آسمانی باپ" تصوّر کرو۔ لوگوں نے اکثر اس کے بارے میں صرف یہ خیال کیا ہے کہ وہ اُن کا خالق، حاکم یا منصف ہے۔ لیکن محکوم یا قیدی کا تعلق حاکم یا منصف کے ساتھ کسی قدر غیر شخصی ہوتا ہے۔ بچّے کا باپ سے البتہ نہایت قریبی اور شخصی رشتہ ہوتا ہے۔ اور وہی ایک ایسا گہرا اور شخصی رشتہ ہے جو خدا چاہتا ہے، کہ ہم اس کے ساتھ رکھیں۔ خدا محبّت ہے اور جب اس کے ارادے ناکام اور بے اثر کر دئے جاتے ہیں تو اس کی محبّت کے کامل اظہار میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے — جب تک کہ ہم خدا کی نسبت یہ نظریہ نہ رکھیں، ہم مسیحی عقیدے کو اچھی طرح سمجھنے کی توقع نہیں کر سکتے۔



# باب سوم

## ثالوث اقدس

اقدس اقدس اقدس۔ ربِ خدائے قادر
صبح کے وقت ہم گاتے حمد تیری اے معبود
اقدس اقدس اقدس اے رحیم و قادر
واحد خدا ہیں پاک ثالوث محمود

اقدس اقدس اقدس ربِ خدائے قادر
ساری مخلوقات کا صرف تو ہی ہے معبود
اقدس اقدس اقدس اے رحیم و قادر
واحد خدا ہیں پاک ثالوث محمود

ابتدائی مسیحی جب انجیل کی بشارت کے لئے دُنیا میں نکلے تو وہ اس بات کا علم رکھتے تھے کہ اُن کے پاس ایک نیا الٰہی مکاشفہ موجود ہے۔ ان کا یہ تجربہ تھا کہ "خدا مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر رہا ہے" (۲۔کرنتھ۔ ۵: ۱۹) انھیں یہودی تعلیم دی گئی تھی، اور اُن کا یہ عقیدہ

تھا کہ خدا صرف ایک ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے اس بات پر کبھی شک نہیں کیا۔ لیکن مسیح میں اُنھیں ایک نیا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یقین کرتے ہیں کہ مسیح میں اُنھوں نے خدا کا دیدار حاصل کیا۔ اُنھوں نے مسیح کو نبی سے بڑا پایا، اور اپنے تجربے میں اُس قول کی صداقت کو دیکھا کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا"۔ (یوحنا ۱۴: ۹) ان کا یہ تجربہ کہ اُن کے گناہ بخش دیئے گئے مسیح سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ محض مسیح کی تعلیم کی اطاعت نہیں کرتے بلکہ اس کی زندگی ان میں ازسرِنو پیدا ہوتی ہے اور وہ اس میں حقیقی زندگی حاصل کرتے ہیں۔

جب وہ مسیح کی تعلیم پر غور کرتے ہیں تو ان کو بہت سی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جن سے وہ دوسرے انسانوں سے متفرق نظر آتا ہے۔ وہ خدا کے کام اپنے ہی نام سے کرتا ہے، اور اس کے نام سے وہ بھی ویسے ہی کام کرتے ہیں: "یسوع ناصری کے نام سے چل پھر"۔ (اعمال ۳: ۶) اور وہ "ابنِ آدم" کا خطاب خاص طور سے اپنے ہی لئے استعمال کرتا ہے جو مسیح کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو "بیٹا" بھی کہتا ہے۔ (متی ۱۱: ۲۷؛ مرقس ۱۴: ۶۲) جس سے وہ خدا کے ساتھ ایک عجیب رشتہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس نے گناہ معاف کرنے کا بھی دعویٰ کیا اور جب وہ گناہ معاف کرتا ہے تو لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے گناہ واقعی دور ہو گئے۔ جس حال کہ صرف خدا گناہ معاف کر سکتا ہے۔ اور اُس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کا منصف ہے۔ اور یہ کہ وہ زندگی عطا کر سکتا ہے۔ اُس نے بوجھ سے دبے ہوئے اور تھکے ماندوں کو اپنے پاس بُلایا تاکہ اُن کی روحوں کو آرام بخشے (متی ۱۱: ۲۸)۔ یہ تمام کام دراصل ایسے ہیں جو صرف خدا کر سکتا ہے۔ تو بھی لوگ جب اُس پر ایمان لاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے دعوے



سچے ہیں۔

اس کے علاوہ ابتدائی مسیحیوں کے تجربے میں ایک اور بات نظر آتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے دورِ خدمت کے اختتام پر مسیح اُن سے جدا نہیں ہوا، بلکہ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں اس کی موجودگی ہمیشہ اُن کے شاملِ حال رہتی ہے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انھیں روح القدس بخشے گا۔ اور مسیحیوں نے اس روح کو حاصل کیا، اور روح کی موجودگی میں انھوں نے مسیح کے ساتھ اتصال کا احساس کیا۔

اگرچہ ان ابتدائی مسیحیوں کا یہ پکا عقیدہ تھا کہ خدا صرف ایک ہے۔ اُن کا تجربہ ان کو مجبور کرتا ہے کہ مسیح کو اور رُوح القدس کو بھی خدا مانیں۔ اور اگرچہ نئے عہدنامے میں وہ اُن الفاظ کو استعمال نہیں کرتے جو بعد کے عقیدوں میں آئے ہیں تو بھی وہ اُن خیالات کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو عقیدوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کے حوالوں کو دیکھئے۔ کلسیوں ۱: ۱۵-۱۷۔ یوحنا ۱: ۱-۱۸ اور عبرانیوں کے خط کی ابتدائی آیات ۱: ۱-۴۔ علاوہ ازیں مقدس پولس کی تعلیمات کے مفہوم کو ملاحظہ کیجئے، اور بالخصوص یہ مشہور دعا "خداوند یسوع مسیح کا فضل اور خدا باپ کی محبت اور رُوح القدس کی رفاقت" (۲۔ کرنتھیوں ۱۳: ۱۴) یہ سب ابتدائی شاگردوں کا تجربہ تھا اور اُن کے وقت سے مسیحی لوگ اس تجربے کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ لیکن ہم اس کی تشریح کس طرح کر سکتے ہیں؟ قریب قریب یہ سب سے پہلا سوال تھا جس کا جواب کلیسیا کو دینا پڑا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اکثر شروع میں چند غلط جوابات پیش کئے گئے۔ ہمیں ان غلط جوابات میں سے چند پر غور کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس لئے کہ ہم اپنے عقیدوں

کا مطلب سمجھ سکیں اور کچھ اس لئے کہ شاید ہم کو بھی ایسی غلطیوں میں پھنسنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اوّل کچھ لوگوں نے ایسی تشریح پیش کی جو یہودی خیال سے مطابقت رکھتی تھی۔ بقول ان کے یسوع ایک نہایت نیک انسان تھا جس پر بپتسمہ کے وقت الٰہی قدرت نازل ہوئی یعنی یسوع محض ایک نبی تھا جو شریعت کو پورا کرنے آیا تھا۔ اس نظریئے کے مطابق مسیحی مذہب صرف ایک نئی شریعت کہا جا سکتا ہے لیکن اُسے ایک نئی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی واضح نہیں ہوتی کہ مسیحیوں کا مسیح کی عبادت کرنا کیوں کر بجا ہے جس حال کہ کسی انسان کی عبادت کرنا چاہے وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو بُت پرستی کے برابر ہے۔ تاہم مسیحیوں کی زندگی میں مسیح کے تجربہ نے اُنھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس کی پرستش کریں۔ لہٰذا یہ نظریہ اطمینان بخش ثابت نہ ہوا کیوں کہ اس سے مسیحی تجربے کی توضیح نہ ہو سکی۔ اس قسم کی تعلیم کو تبنیت (Adoptianism) یا تحرک واحدیت (Dynamic Monarchianism) کہتے ہیں۔

اگر یسوع ایک ایسا انسان نہیں تھا جس پر محض وحی نازل ہوئی تو وہ ضرور کسی نہ کسی صورت سے الٰہی ہوگا۔ اسی لئے لوگوں نے یہ کہنے کی کوشش کی کہ وہ خدا ہے۔ لیکن یہ بھید سمجھنا آسان نہیں کہ خدا اور انسان کس طرح ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ ایک قدیم غلطی میں پڑ گئے اور سوچنے لگے کہ ہمارے جسم اور یہ دنیا دونوں بُرے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ قول تھا کہ خدا دراصل انسان نہیں بنا بلکہ وہ محض انسان معلوم ہوتا تھا اور اُس کا دُکھ اُٹھانا اور صلیب پر چڑھنا بھی ظاہری تھا۔ اس خیال کو



ڈوسیٹزم (Docetism) کہتے ہیں۔ جو ایک یونانی لفظ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں "معلوم ہونا"۔ اگر انسان کو نجات حاصل کرنے کے لئے صرف علم کی ضرورت ہوتی جیسا کہ یونانی لوگ اکثر کہتے تھے تو ایسا مسیح کافی ہوتا۔ لیکن صرف روشن خیالی سے ہماری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ ہمیں روحانی عذاب سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اگر مسیح واقعی انسان نہیں تھا تو ہم لوگوں کے لئے جو جسم رکھتے ہیں حقیقی نجات نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں یہ نظریہ ان لوگوں کے تجربہ کی سچائیوں سے مطابقت نہیں رکھتا جو مسیح کو بخوبی جانتے تھے۔ لہٰذا ڈوسیٹزم نے بھی سچائی کو نہیں بیان کیا۔ فی زمانہ شاید کوئی شخص ڈوسیٹزم کو اس صورت میں نہ پیش کرے۔ لیکن ہم اکثر اوقات مسیح کی نسبت ایسے تصورات سُنتے ہیں جن سے یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ وہ حقیقتاً انسان نہیں تھا۔ اسی طرح اس قسم کے تمام دیگر خیالات غلط ہیں۔

مسیحی لوگ باپ، بیٹے، اور رُوح القدس کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے بہتوں نے یہ خیال کیا کہ وہ تین خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال کہ تین خدا کی پرستش کرنا غلط ہے بالکل بجا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ خدا صرف ایک ہو سکتا ہے لیکن اس خدا نے اپنے آپ کو تین صورتوں میں ظاہر کیا ہے۔ عہد نامۂ عتیق میں اس نے اپنے آپ کو باپ کی صورت میں ظاہر کیا۔ عہد نامۂ جدید میں بیٹے کی صورت میں اور مسیحی تجربے میں روح القدس کی صورت میں۔ اگرچہ ہم خدا کو تین صورتوں میں جان سکتے ہیں۔ تاہم اس کی ذات میں کوئی اندرونی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ جس طرح کہ ہم ایک ہی شخص کو بیک وقت بحیثیت استاد، شہری اور دوست جان سکتے ہیں۔ ان تینوں صورتوں میں فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ شخص ایک ہی فرد سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریے کی بہت سی باتیں تسلیم کرنے کے قابل

معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم یہ نظریہ کل سچائیوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگرچہ ہمارے خداوند کا یہ کہنا تھا کہ "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰: ۳۰) تاہم اُس نے ہمیشہ اپنے اور باپ کے درمیان امتیاز محسوس کیا۔ اسی لئے وہ باپ سے دُعا کرتا تھا اور کم از کم ایک مرتبہ اپنے اور باپ کے درمیان ارادہ کے امتیاز کا اقرار کرتا ہے: "تو بھی نہ جیسا میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے" (متی ۲۶: ۳۹) ایک اور جگہ اُس نے اپنے اور روح القدس کے درمیان امتیاز قائم کیا۔ جس کی نسبت اُس نے کہا کہ وہ "دوسرا مددگار" ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۱۶) جسے وہ بھیجنے والا تھا۔ پس یہ نظریہ اس صورت میں بھی انجیل کی تمام سچائیوں کو ثابت کرنے میں قاصر رہا اور کلیسیا نے واجبی طور پر اسے رد کیا۔ یہ نظریہ تین ناموں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ صورتی واحدیت (Modal Monarchianism) جس سے اس نظریے کا مطلب ظاہر ہوتا ہے یا سبلوسیت (Sabellianism) جو اس نظریہ کے ایک بڑے حامی سبلوس (Sabellius) کے نام سے بنا ہے، یا پیٹری پیسیزم (Patripassianism) جو اس نظریہ کے ان مخالفوں نے دیا تھا جو یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خداوند کی اذیت خدا نے خود اُٹھائی۔

اس تعلیم کی مخالفت میں ایک نہایت خطرناک بدعت ظہور میں آئی جس سے کلیسیا کو دوچار ہونا پڑا۔ اس بدعت کو آریسیت (Arianism) کہتے ہیں۔ یہ بدعت آریوس (Arius) کے نام سے موسوم ہے جو اس نظریے کا بہت زبردست حامی تھا۔ آریوس نے امتیاز پر بڑا زور دیا اور کہا کہ چونکہ مسیح کو "بیٹا" کہا گیا، جو تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے" (کلسیوں ۱: ۱۵) لہٰذا باپ نے اُسے خلق کیا، اور ایک وقت ایسا تھا جب وہ موجود نہ تھا۔



اس لئے مسیح مخلوق ہے۔ الوہیت رکھتا تھا۔ پر خدا نہیں تھا۔ آریوس کی یہ بھی تعلیم تھی تجسّد کے وقت مسیح نے انسانی جسم اختیار کیا پر انسانی روح نہیں اختیار کی۔ یہ مسئلہ سمجھنے میں تو کافی آسان معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس سے مسیحی مذہب کے برباد ہونے کا بڑا اندیشہ تھا۔ کیونکہ مسیح دراصل نہ خدا رہتا نہ انسان، اور یوں خدا اور انسان کے درمیان حقیقی مصالحت کرنے والا نہیں بن سکتا۔ مزید برآں اگر مسیح ایک مخلوق ہستی ہوتا اور آدمیوں اور فرشتوں سے کتنا ہی بالاتر کیوں نہ ہوتا اس کی پرستش کرنا ہمارے لئے گناہ ہوتا۔

اس بدعت کو ناجائز ٹھہرانے کے لئے چند ایسے الفاظ اور محاورات کی ضرورت محسوس ہوئی جو کتابِ مقدس میں نہیں پائے جاتے، اور بہت سے لوگ ان کے استعمال کئے جانے پر کافی عرصہ تک رضامند نہ ہوئے۔ کیونکہ زیادہ تر مسیحی صرف کتابِ مقدس کے الفاظ استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ لیکن اب یہ بات ضروری ثابت ہوئی کہ کتابِ مقدس کے الفاظ کے علاوہ کچھ نئے الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے یہ بدعتیں رد کی جا سکیں۔ اب ہم ان نئی اصطلاحات میں سے چند پر غور کریں گے تاکہ ہم اس تعلیم کو سمجھ سکیں جسے کلیسیا صحیح قرار دیتی ہے۔

یونانی فلسفیوں کا قول ہے کہ ہر شے میں اوسیا (Ousia) یعنی اس کی اصلیت یا خاص جوہر پایا جاتا ہے جس سے اس کی ماہیت قائم ہوتی ہے۔ اوسیا ہی کے سبب سے ایک شے لکڑی کہی جاتی ہے اور لوہا نہیں کہی جاتی۔ یہ ان صفتوں سے مُمیّز ہے جنھیں ہم اپنے حواس سے جان سکتے ہیں۔ (مثلاً رنگ) کیونکہ مختلف اشیاء ایک سی صفات رکھ سکتی ہیں۔ مثلاً لوہا اور لکڑی دونوں سیاہ، سخت، ہموار وغیرہ ہو سکتے ہیں، مگر اوسیا ایک کو لکڑی اور دوسرے کو لوہا بناتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک اور لفظ ہائپوسٹسس (Hypostasis)

استعمال کیا جس کے عنقریب وہی معنی ہیں جو اوسیا کے ہیں۔ آریوس کا یہ قول تھا کہ مسیح کا اوسیا باپ کے اوسیا کی طرح تو تھا لیکن اس کا اوسیا جداگانہ تھا۔ ایک اور یونانی لفظ جس پر ہمیں غور کرنا ضروری ہے پروسوپان (Prosopon) ہے۔ جس کے معنی ہیں ڈرامے کا کردار۔ چنانچہ ایک ایکٹر کسی تاریخی ہستی کے پروسوپان یا کردار کو ادا کر سکتا ہے۔ چونکہ سبلوسیوں نے اس لفظ کو خدا کے تین پہلوؤں (Aspects) کے لئے استعمال کیا۔ اس لئے راسخ الاعتقاد مسیحیوں نے اسے ناپسند کیا۔

اب ہم ان لاطینی الفاظ پر بھی غور کریں جو دینیات کی بحثوں میں استعمال کئے جا چکے ہیں۔ اور جن سے انگریزی اصطلاحات اخذ کی گئی ہیں۔ لاطینی میں لفظ "اسنس" (Essence) یونانی "اوسیا" کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن یہ لفظ بہت کم استعمال کیا گیا۔ بجائے اس کے انھوں نے لفظ سبزٹنس (Substance) استعمال کرنا پسند کیا جو "ہائپوسٹسس" کا لفظی ترجمہ ہے۔ مگر قانونی اصطلاح میں یہ لفظ دوسرے معنی رکھتا ہے جس سے مقبوضات یا ملکیت مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس فقرے میں آیا ہے "اس نے اپنا تمام مال (Substance) اُڑا دیا"۔ ہم جانتے ہیں کہ دو یا دو سے زائد لوگ ایک جائداد یا ملکیت پر باسانی قابض ہو سکتے ہیں، اور اگرچہ دینیات میں لفظ "سبزٹنس" کا مطلب فلسفیانہ ہے جس سے کسی شے کی صفات یا عوارض کے بجائے اس کی ماہیت قائم کی جاتی ہے۔ تاہم دراصل اس لفظ کے قانونی مفہوم سے اس کو ایک مقبول عام اصطلاح قرار دینے میں بڑی مدد ملی۔ لاطینی لوگ لفظ "پرسن" (Person) کو ڈرامے کے کردار کے لئے استعمال کرتے تھے، اور ہم اب بھی اسی معنی میں "ڈرامٹس پرزنائی"



(Dramatis Personae) کا فقرہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ قانونی معنی بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ حیثیت جس میں ایک شخص اپنے آپ کو عدالت میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح ایک انسان کئی حیثیتیں اختیار کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ شہر کا عام باشندہ بھی ہو سکتا ہے اور سرکاری افسر بھی بلکہ رومی قانون کے مطابق تو کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً عورتیں اور غلام۔

جس وقت کلیسیا آریوسیت سے جنگ کر رہی تھی تو اسے ان تمام اصطلاحات سے کام لینا پڑا اور یہ رائے قائم کی گئی کہ بیٹے کا اوسیا وہی ہے جو باپ کا ہے اور یوں آریوس کی رائے کی تردید کی گئی۔ جس کا یہ قول تھا کہ بیٹے کا اوسیا باپ کے اوسیا کی مانند ہے۔ لیکن اس واحد اوسیا میں تین ہائپوسٹسس یا امتیازات پائے جاتے ہیں۔ اس رائے سے سبلوس کے نظریے کی بھی تردید ہوئی۔ جن کا یہ قول تھا کہ اوسیا تو ایک ہی ہے۔ مگر یہ تین امتیازات حقیقی نہیں بلکہ محض تین "پروسوپا" (Prosopa) یا تین صورتیں ہیں۔ جن میں خدا نے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ اس طرح کلیسیا نے ان باتوں پر زور دیتے ہوئے جن کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اس مسئلے کو یوں پیش کیا۔ خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، لیکن اس واحد خدا کی ذات میں تین ازلی امتیازات ہیں جو ظاہری نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔

اس تعریف کو لاطینی زبان میں ادا کرنے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ یہ ہیں۔ ایک سبزٹنس (Substance) یعنی جوہر اور تین "پرسنز" یعنی اقانیم۔ لیکن بدقسمتی سے یہ الفاظ لاطینی زبان میں اور انگریزی زبان میں اور بھی زیادہ مادی مفہوم رکھتے تھے بہ نسبت یونانی الفاظ کے۔ اس زمانے

میں ان سے غلط فہمی کا بھی اندیشہ تھا۔ کیونکہ یہ الفاظ یونانی الفاظ کے مترادف
نہیں تھے۔ اور فی زمانہ "سبزٹنس" اور "پرسن" کے معنی نہایت مختلف ہو گئے ہیں۔
بہرحال ہمیں ان کا مطلب یونانی الفاظ کے معنوں میں سمجھنا چاہیئے۔ یعنی خدا ایک
ہے۔ لیکن اُس وحدت میں ایک ازلی سہ گونہ امتیاز پایا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اب ہم جوہر اور عرض کے تصوّر
کو استعمال میں نہیں لاتے۔ لہٰذا ہمیں ان اصطلاحات کو دینیات میں استعمال نہیں
کرنا چاہیئے۔ لیکن در اصل ہمارے پاس ان سے بہتر اصطلاحات موجود نہیں۔ ہمارے
فلسفی اس بات پر بالکل متفق الرائے نہیں کہ حقیقت کی تفسیر کس طرح کی جائے۔ لیکن
جس حال کہ ہم جانتے ہیں کہ اصطلاحات حقیقت کی بہت کم تشریح کرتی ہیں۔ تاہم ان سے
یہ فائدہ ہے کہ یہ ان بنیادی حقیقتوں کی حفاظت کرتی ہیں جنھیں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔

پاک ثالوث پر غور کرتے وقت ہمیں باپ کے مونارکیہ (Monarchia)
یعنی ملکوت کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی الوہیت کا منبع ہے۔ اور اس کے ساتھ
تثلیث کے باہمی ربط کو بھی خیال میں رکھنا چاہیئے۔ یعنی ثالوث اقدس کے کسی ایک
اقنوم کے ہر کام میں تینوں اقانیم شریک ہوتے ہیں۔ جب ہم اس مسئلے پر غور کرتے ہیں
تو اس کا مفہوم نہایت پُراسرار معلوم ہوتا ہے اور ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ
اس کو پورے طور پر سمجھنا غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم یاد رکھیں کہ جب ہم اپنی ہی
ذات کو نہیں سمجھ سکتے تو خدا کی ذات کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال پاک ثالوث کے
تصوّر سے خدا کی ذات کو کسی حد تک سمجھنے میں یقیناً بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے ارادے،
اس کے خیالات، اس کی محبت، یہ سب اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے
کہ اگر وہ واحدِ مطلق ہوتا تو ان باتوں کے حقیقی معنی کو تصوّر کرنا دشوار ہو جاتا۔ اس
حالت میں ایسا معلوم ہوتا گویا وہ اپنے وجود کو مکمل بنانے کے لئے کائنات کا



محتاج ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ذہن میں یہ اعلیٰ خیال آتا ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے
کائنات اس کی ازلی محبّت کا اظہار ہے جو ثالوثِ اقدس کے تین اقانیم میں پائی جاتی
ہے۔

تثلیث کے دوسرے اقنوم کو نئے عہد نامے میں بیٹا یا لوگوس (Logos)
کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لفظ "لوگوس" مقدس یوحنّا کی انجیل کی تمہید میں آیا
ہے۔ جس کا ترجمہ اردو بائیبل میں لفظِ "کلام" سے کیا گیا ہے۔ لیکن اس یونانی لفظ
کا کسی دوسری زبان میں موزوں ترجمہ غیر ممکن ہے۔ اس لئے یونانی لفظ لوگوس
(Logos) ہی استعمال کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے الفاظ اظہارِ خیالات
کے ذرائع ہیں۔ لہٰذا تثلیث کے دوسرے اقنوم کو لوگوس (Logos) سے موسوم
کرنے سے جو مطلب نکلتا تھا اُس کا ایک جزو یہ ہے۔ اس کا کام الٰہی خیالات کو ظاہر
کرنا ہے۔ الفاظ کا دوسرا کام استدلال ہے۔ الفاظ کے بغیر ہم مشکل سے غور وفکر
کر سکتے ہیں۔ لہٰذا لوگوس الٰہی استدلال کے معنی میں آیا ہے۔ کچھ یونانی فلسفیوں کا
کہنا ہے کہ کائنات کی تہ میں لوگوس یا الٰہی ادراک پایا جاتا ہے۔ جس سے انسانی
عقل و فہم کا استخراج ہوتا ہے۔ عہد نامہ عتیق کے لکھنے والے اکثر کلام اللہ کا ذکر
پیدائش کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ وہ الٰہی حکمت کا بھی ذکر
کرتے ہیں۔ اگرچہ عہد نامۂ عتیق میں امتیازِ اقانیم کا تصوّر نہیں پایا جاتا، تاہم اس سے
ہمارے خداوند کی نسبت صحیح تصوّرات مُرتّب کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ تمام خیالات
لوگوس کے تصوّر پر مشتمل ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں نکایا کے عقیدے کے اس فقرے پر
غور کرنا چاہیئے "جس سے کل چیزیں بنیں"، جس کا مطلب یہ ہے کہ سب چیزیں کلام یا
بیٹے کے وسیلے سے بنیں۔ اس کے علاوہ لفظ "اکلوتا" پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ تمام
مسیحی مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ باپ الوہیت کا واحد منبع ہے۔ اور کسی نہ کسی معنی

معنی میں بیٹا اور روح القدس اس سے ماخوذ ہیں۔ اس تصور کا مطلب سمجھنا ہمارے لئے نہایت مشکل ہے۔ اور یہ معلوم کرنا کہ یہ کس طرح سے ہوا اور بھی زیادہ بعید الفہم ہے۔ پس ہم کتابِ مقدّس کے الفاظ استعمال تو کر سکتے ہیں لیکن اُن کے صحیح استعمال سے تجاوز کرنا بجا نہیں سمجھا جا سکتا۔ کتابِ مقدّس میں یہ اکثر آیا ہے کہ ہمارا خداوند باپ کا اکلوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا شاید درست نہ ہوگا کہ وہ صرف ایک مرتبہ باپ سے صادر ہوا جس طرح کہ ایک بچّہ اپنے والدین سے صرف ایک مرتبہ پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک سرمدی عمل ہے جس طرح کہ ہم روشنی کی شعاعوں کی اعلیٰ مثال میں دیکھتے ہیں کہ شعاعیں دائمی طور پر سورج سے نکلتی رہتی ہیں۔ سورج ان شعاعوں کا منبع ہے۔ اور فطرتی طور پر شعاعیں ہمیشہ اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح باپ الوہیت کا منبع ہے لیکن لوگوس کا صادر ہونا اس کی فطرت کا ازلی اور ابدی فعل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ روح القدس" باپ اور بیٹے سے" صادر ہے۔ یہ بھی جس قدر ہو سکتا ہے کتابِ مقدّس کے الفاظ کے مطابق ہے۔ کتابِ مقدّس میں ہر جگہ اُس کی نسبت یہ آیا ہے کہ وہ بیٹے کے ذریعے سے ظاہر ہوا اور بیٹے کے بارے میں بتاتا ہے، اور یہ بات سچ معلوم ہوتی ہے نہ صرف اس طریقے کے متعلق جس سے ہم اس کا علم حاصل کرتے ہیں، بلکہ اس کی اصلی ذات کے حق میں بھی سچ ہے۔

بعض یونانی ماہرینِ دینیات نے نکایا (Nicene) کے عقیدے کے اس فقرہ پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ الوہیت کے دو منبع ہیں۔ دراصل اس عبارت کا صحیح مطلب اس فقرے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ "وہ باپ سے بیٹے کے وسیلے سے صادر ہوتا ہے"۔ شاید ہم اس کو بھی



سورج کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی جس طرح روشنی شعاعوں کے ذریعے سے سورج سے نکلتی ہے۔

مسیحی مکاشفہ میں روح القدس کا کام الہام اور انسانوں کی تخصیص سے متعلق ہے۔ روح کے اس کام کو لوگوس کے کام سے ممیز کرنا آسان نہیں۔ حالانکہ لوگوس اور روح القدس کا کام قطعی طور پر یکساں نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال ہمیں روح القدس کے کام میں زیادہ امتیاز نہیں قائم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں پاک ثالوث کے کسی ایک اقنوم کے ہر کام میں باقی دونوں اقنوم بھی شامل ہوتے ہیں۔

# باب چہارم

## تجسّد

ساری مخلوقات سے پہلے	باپ کے دل سے جو مولود
الفا سب چیزوں کا خالق	عالم میں جو ہیں نمود
اومیگا ہے جس کی خاطر	ساری یہ خلقت موجود
ابد تک ابد الآباد

تیری اے مسیح اور باپ کی	اور پاک روح کی ہو ثنا
شان و شوکت اور شکریہ	حمد اور گیت لا انتہا
ظفرمندی اور بادشاہی	تیری ہے خداوندا
ابد تک ابد الآباد

آریوسیت سے جب جنگ ختم ہو چکی تو یہ رائے قطعی طور پر قائم ہو گئی کہ مسیح کامل خدا ہے۔ لیکن اس بات پر اب تک فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ لوگوس کا تجسد کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ (یوح ۱: ۱۴) اس مسئلے کو بھی حل کرنے کے لئے کئی تجاویز پیش کی گئیں جو حقیقت کو واضح کرنے میں قاصر ثابت ہوئیں اور جن سے ہمارے عقیدے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہوا۔ اب ہم ان میں سے بعض تجاویز پر غور کریں گے۔





سب سے پہلی تجویز لودیکیہ کے رہنے والے اپولی ناریوس (Apollinarius) نے پیش کی، جسے اپالی نارسیت (Apollinarianism) کہتے ہیں۔

اپولی ناریوس کا یہ قول تھا کہ ہمارے خداوند نے انسانی روح کو اختیار نہیں کیا۔ ورنہ وہ صاحبِ ارادہ ہوتا اور یوں گناہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ رائے قائم کی کہ ہمارے خداوند نے صرف انسانی جسم اور عقل اختیار کی، لیکن انسانی روح نہیں اختیار کی۔ جب یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ اس تجویز کی رو سے وہ کامل انسان نہیں کہا جا سکتا تو اپولی ناریوس نے یہ جواب پیش کیا کہ اس کی روح لوگوس سے معمور رہی۔ اس لئے اُسے انسانی روح کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لوگوس خود رُوح کی جگہ لیتا ہے۔ اگر تجسد کا یہ خیال صحیح ہوتا تو اس سے یہ مطلب نکلتا کہ ہماری روحوں کی نجات نہیں ہو سکتی جس حال کہ ہماری روحوں کو نجات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس نظریے سے مسیحی اُمید کو بڑا نقصان پہنچتا۔ علاوہ ازیں یہ مسیحی تجربے کے برعکس ہے۔ کیونکہ مسیحی اپنی روح کی نجات اپنے تجربے میں محسوس کرتا ہے۔ اس تجویز کے خلاف کلیسیا نے یہ رائے قائم کی کہ مسیح "کامل انسان" ہے۔ اور "کامل خدا" بھی ہے۔

لیکن اپالی نارسیت کے کچھ مخالفین اس سے متضاد غلطی میں جا پڑے۔ جسے نسطوریت (Nestorianism) کہتے ہیں۔ یہ بدعت ایک رقیب کلیسیا (یعنی انطاکیہ) کے بشپ نسطوریوس کے نام سے موسوم ہے۔ حالانکہ نسطوریوس خود نسطوری نہیں تھا۔ چونکہ انطاکیہ کے علماء مسیحیت کے تواریخی پہلو پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں اس لئے وہ خداوند کی انسانیت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ نسطوری لوگ کہتے تھے کہ مسیح کا خدا کے ساتھ ارادی اتحاد تھا۔ مسیح ایک نیک انسان تھا جس میں لوگوس اس طرح مسکن گزیں تھا جس طرح خدا کسی ہیکل میں سکونت کرتا ہے۔

ایک طرح سے یہ تعلق اُس اتصال سے متفرق نہیں جو خدا اور کسی نیک انسان
کے درمیان قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں دو شخصیتیں ہو جاتیں۔ لیکن انجیل
کے بیان سے مسیح کی ذات میں کبھی دو شخصیتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ ہماری شخصیت کے
بالمقابل جس میں ہمیشہ کشمکش یا تصادم جاری رہتا ہے۔ مسیح کی شخصیت میں کامل موافقت
تھی۔ اگر یہ اتصال محض ارادی ہوتا تو آدم زاد یسوع الٰہی لوگوں سے ممیز ہوتا۔
کوئی نیک انسان مسیح کی طرح اپنی ذات کو خدا کی ذات کے ساتھ ایک ہونے کا دعویٰ
نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ بنی نوع انسان کے لئے مسیح کا کام ایک نبی کے کام
سے بہتر نہ ہوتا۔ وہ انسانوں کو نجات نہیں دے سکتا۔ اس نظریے کے خلاف کلیسیا
نے یہ اصرار کیا کہ مسیح میں خدا اور انسان دونوں کی کامل فطرتیں موجود تھیں۔ مگر
ہے وہ ایک ہی اقنوم جو منقسم نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ایک اور بدعت نسطوری نظریے کے خلاف ظہور میں آئی جسے
یوتخیسیت (Eutychianism) کہتے ہیں۔ جو قسطنطینوی یوتخس
نے شروع کی تھی، جو اس بدعت کا خاص استاد تھا۔ اُس نے یہ خیال پیش کیا کہ قبل
از تجسد دو جداگانہ فطرتیں تھیں یعنی الٰہی اور انسانی، مگر تجسّد کے بعد انسانیت
الوہیت میں جذب ہو گئی جس طرح سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں گھل مل کر غائب ہو جاتا
ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہمارے خداوند کی انسانیت عملی طور پر معدوم ہو کر
الوہیت کو چھپانے کے لئے محض ایک حجاب بن کر رہ گئی جو دراصل دوسیٹزم کی
جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے دوسری صورت ہے۔

کلیسیا نے اس مسئلے میں بھی ثالوث اقدس کے مسئلے کی طرح صرف مسئلے کے
اجزا پر زور دیا۔ اس سے آگے اس کی کوئی تعریف قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔
جس صورت میں ابتدائی کانسلوں نے خصوصاً نکایا (Nicene) قسطنطنیا



(Constantinople) اور کالسیدن (Chalcedon) کی
کانسلوں نے تثلیث اور تجسّد کے مسائل کو متعین کیا۔ اس کی نقل کلیسیا کے عقائد
کے تمام مجموعوں میں مثلاً "تھرٹی نائن آرٹیکلس" (Thirty Nine Articles)
"ویسٹمنسٹر کا عقیدہ" (Westminster Confession) وغیرہ
میں موجود ہے۔

ان عقائد میں کلیسیا نے اس بات پر زور دیا کہ مسیح میں الوہیت اور
اور انسانیت کی دونوں فطرتوں کا اتصال تھا لیکن اس اتصال میں اقنوم
ایک ہی تھا۔ اس مسئلے کو اتھانا سیوسی عقیدہ (ATHANASIAN CREED)
میں اس باہمی اتصال کے ذریعے واضح کیا گیا ہے جو ایک انسان میں روح
اور جسم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کلیسیا نے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ
ہمارا خداوند کامل انسانیت رکھتا تھا جس کے سبب وہ انسانی زندگی کی
تمام حد بندیوں میں شریک تھا سوا اس کے کہ اس سے گناہ نہیں ہوا۔ اس
نظریے کے باعث ہم کو [illegible] کے مسئلے کے ایک نہایت دقیق نکتے سے دوچار
ہونا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان بن کر لوگوں نے اپنے آپ کو کیونکر انسانیت
کی بندشوں سے محدود کر دیا۔ جس حال کہ ہمیں لوگوں کی نسبت یہ بات خیال
میں رکھنی چاہیئے کہ تجسد کی حالت میں بھی وہ الوہیت کے معمولی کام کر رہا
تھا۔ تاہم اُس نے اپنے آپ کو اپنے کام کے اس حصّے سے جو تجسد میں شریک تھا
بالکل خالی کر دیا تاکہ بقول پولس رسول (فلپ ۲: ۷) حقیقی تجسد ممکن ہو سکے۔ یہ
ظاہر ہے کہ اگرچہ مسیح خدائے متجسد تھا تاہم وہ خدا کی ہمہ دانی میں شرکت نہیں رکھتا
اور اپنی قدرت میں حد بندی اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا علم بھی محدود
ہو گیا تھا "جس طرح کہ وہ قد و قامت میں ترقی کرتا گیا اسی طرح وہ حکمت میں

بھی ترقی کرتا گیا" (لوقا ۲: ۵۲) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ ہماری محدودیت میں شریک نہ ہوتا تو وہ واقعی ہماری انسانی زندگی میں شریک نہ ہوتا۔ اگرچہ ہمیں مسیح کے علم کی محدودیت کو تسلیم کرنا لازمی ہے تجسّد کی حقیقت اس امر کی تصدیق ضرور کرتی ہے کہ جو مکاشفہ ہمارے خداوند نے خدا کے کردار، ارادہ اور مقصد کا کیا ہے۔ سچا ہے۔

وہ خدا کی طرح ہر جگہ حاضر نہیں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی طاقت محدود تھی۔ کیونکہ یہ مکاشفہ تجسّد کے مقصد کا ایک جزو ہے۔

بعض اوقات قدیم اساتذہ نے یہ تعلیم دی کہ ہمارا خداوند "ایک انسان" نہیں تھا بلکہ انسانیت اس میں تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ ایک انسانی شخصیت نہیں تھا کیونکہ وہ اس بات پر زیادہ زور دینا چاہتے تھے کہ اس میں شخصیت کے دو مرکز نہیں تھے۔ بلکہ وہ واحد اقنوم تھا اور اس کی شخصیت کلام یعنی لوگوس سے مسلسل تھی۔ یہ ایک نہایت اہم حقیقت ہے جس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ حالانکہ ایسے بیان سے غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ راسخ الاعتقاد اساتذہ کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ ہمارے خداوند میں انسانی قوت ارادی موجود تھی۔ اور آج کل ہماری نظر میں ارادہ شخصیت کا نہایت اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں خداوند کو ہمیشہ واحد مسیح سمجھنا چاہیئے۔ اور کہ اس کی شخصیت کا مرکز وہی ہے جو لوگوس کا مرکز ہے۔

جب ہم اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اس نظریے کا امکان ہو سکتا ہے کہ جب ہمارا خداوند بھوکا ہوتا تھا یا تھک جاتا تھا یا روتا تھا تو ان حالتوں میں وہ اپنی انسانیت ظاہر کرتا تھا۔ اور جب وہ بیماروں کو اچھا کرتا یا کثیر تعداد لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا تو وہ اپنی الوہیت ظاہر کرتا تھا۔ اس خیال کے مطابق مسیح دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ گویا وہ دو شخصیتیں رکھتا تھا۔ اس کی کمزوری اور قدرت دونوں میں ہم کو ہمیشہ ایک ہی مسیح نظر آنا چاہیئے جو خدا اور انسان دونوں ہے۔ انسانیت



میں بھی وہ ہمیشہ کامل مظہر اللہ ہے۔" اے مسیح تیری انتہائی انسانیت میں تیری انتہائی الوہیت ہے۔"

ایک اور اہم حقیقت جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ مسیح میں اب بھی الوہیت اور انسانیت موجود ہے۔ صعود کے وقت جب ہمارا خداوند باپ کے پاس واپس چلا گیا تو اس موقع پر تجسّد کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اب بھی کامل انسان ہے اور اپنی انسانیت کے وسیلے سے جو الوہیت میں سمائی ہوئی ہے ہمارا ایسا سردار کاہن ہے جو ہمیشہ ہمارے لئے سفارش کرتا ہے۔" (عبر ۷: ۲۵)

اس لئے ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ علمائے دین جب ہمارے خداوند کی انسانیت کا ذکر کرتے ہیں تو اکثر یہ کہنا پسند کرتے ہیں کہ وہ انسان ہے نہ کہ ایک انسانی فرد۔ ہمیں مسیح کو ایک انسانی فرد نہیں بلکہ کل انسانیت کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی قربانی محض ایک انسانی فرد کی حیثیت میں نہیں تھی بلکہ کل انسانیت کی قربانی تھی۔ لہٰذا اس کا گناہ پر فتح پانا کل بنی نوع انسان کی فتح کے مترادف ہے۔ تجسّد کے وقت مسیح نے انسانیت کو الوہیت میں لے لیا۔ اور اس عمل سے اس نے خدا کے ساتھ ہمارا میل کرا دیا ہے۔ یہی تجسّد کا وہ پہلو ہے جو ہمیں یہ امید اور یہ یقین دلاتا ہے کہ ہم مسیح کی زندگی میں شریک ہیں اور کہ ہم اس میں پائے جاتے ہیں۔

مسئلہ تجسّد کا ہمارے خداوند کی معجزانہ پیدائش سے گہرا تعلق ہے۔ ضرورت نہیں کہ ہم اس وقت تاریخی یا علمی ثبوت کی تفتیش کریں۔ کیونکہ اس وقت ہمارا مقصد مسئلہ سے ہے۔

اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ اس کے تواریخی اثبات اس قدر مضبوط ہیں کہ اگر ہم اعجازی حمل کے خیال کو رد کرنا چاہیں تو یہ دیگر اسباب کی بنا پر کرنا پڑے گا۔ اور کم از کم سائنس ایسے حمل کے امکان کی مانع نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تجسّد کا

اسی طریقے سے ہوا ہوگا ۔ اور فی زمانہ اکثر لوگ کنواری سے پیدا ہونے کو اسی بنا پر
تسلیم کرتے ہیں کہ مسیح متجسد کلام تھا۔ کنواری سے پیدا ہونا تجسد کو ثابت نہیں کرتا بلکہ
اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ تجسد میں خدا نے ایک نیا کام انسانی زندگی میں شروع
کیا اور ہم مسیح کو محض اپنے وقت کا ماحصل یا پھل نہیں کہہ سکتے۔ جو دوسرے لوگوں کی
نسبت کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس میں نئی زندگی شروع ہوتی ہے ۔ اس میں تخلیق کا
از سر نو آغاز ہوتا ہے ۔

ایک بات کا ہمیں اور خیال رکھنا چاہیئے، حالانکہ اُسے ثابت نہیں کیا
جا سکتا۔ کلیسیا کے کئی اعلیٰ مفکرین کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر گناہ دنیا میں نہ بھی ہوتا
تاہم تجسد ضرور عمل میں آتا۔ کیونکہ تجسد محض انسان کی غلطی کو درست نہیں کرتا
بلکہ انسانی زندگی کو الٰہی مقصد کے مطابق مکمل بناتا ہے۔ اس حالت میں تجسد
دکھ و درد سے خالی ہوتا۔ لیکن تواریخ میں جس تجسد کو ہم دیکھتے ہیں وہ نہ صرف
گناہ کے لئے خدا کا علاج ہے بلکہ وہ انسان میں الٰہی مقصد کی تکمیل ہے ۔

# باب پنجم

## انسان

انسان کیا ہے کہ تو اسے یاد رکھے
اور آدم زاد کیا کہ تو اس کی خبر لے
کیونکہ تو نے اسے خدا سے کچھ ہی کمتر بنایا ہے
اور جلال اور شوکت سے اُسے تاجدار کرتا ہے
تو نے اُسے اپنی دستکاری پر تسلط بخشا ہے
تو نے سب کچھ اُس کے قدموں کے نیچے کر دیا
اے خداوند ہمارے رب
تیرا نام زمین پر کیسا بزرگ ہے!
(زبور ۸: ۴، ۵، ۶، ۹)

کتاب مقدس کی افتتاح پیدائش کے بیان سے ہوتی ہے جس میں انسان
اشرف المخلوقات قرار دیا جاتا ہے ۔ اس بیان میں انسان خود اپنے آپ،
دنیا سے اور خدا کے ساتھ صلح کی حالت میں دکھایا گیا ہے ۔ اس تصویر میں
انسان کی ایسی حالت نہیں کہ اُسے کامل کہا جا سکے ۔ لیکن ہم اُس کو اُن
بہترین حالات میں دیکھتے ہیں جن میں وہ ترقی کر کے خدا کے تمام مقاصد کی

تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔ اس تکمیل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ انسان کے کام تھے۔ یہ کام وقت طلب ضرور تھے۔ لیکن ان دقتوں سے دوچار ہو کر اور ان پر غالب آ کر انسان ترقی کر سکتا تھا۔ انسانی زندگی کی ترقی کی ایک اور شرط جو ہمیں اس تصویر میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان تنہا رہ کر کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس امر میں اُسے رفاقت کی ضرورت ہے جس کی بنیاد خاندان پر قائم ہے۔

اس تصویر میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ انسان کا مادّی جسم خدا کے جسم کی طرح بنایا گیا ہے۔ لیکن بہت جلد یہ نظریہ اس گہرے خیال میں تبدیل ہو گیا کہ انسان کی فطرت میں ایسی صفت ہے جو خدا کی ذات سے مشابہت رکھتی ہے جس سے انسان خدا کے ساتھ رفاقت اور مشارکت رکھ سکتا ہے اور خدا کے کاموں میں حصہ لے سکتا ہے۔

پیدائش کی کتاب کے ابتدائی ابواب میں ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان جانوروں سے بھی رشتہ رکھتا ہے۔ جانور اور انسان چھٹے دن خلق کئے گئے۔ (پیدائش ۱: ۲۴-۳۱) اور انسان خاک سے بنایا گیا (پیدائش ۲: ۷) اگرچہ دونوں میں باہمی رشتہ پایا جاتا ہے۔ تاہم ان میں تفاوت بھی ہے کیونکہ لکھا ہے کہ "جانوروں میں صرف آدم کے لئے ساتھی نہیں پایا گیا" (پیدائش ۲: ۲۰) صرف انسان (آدم) ہی خدا کی شکل پر بنایا گیا۔ اگرچہ یہ کہنا درست ہے کہ علوم جدیدہ اور سائنس کی رو سے فی زمانہ ہمیں یہ تصویر دوسرے طریقوں پر کھینچنی چاہئے جس کی شکل بھی متفرق ہونی چاہئیے۔ تاہم اس کے بنیادی اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے بڑھے ہوئے علم کے باوجود انسان کی حقیقی صورت ہمیشہ وہی رہے گی۔ جیسا خدا نے اسے ابتدا میں بنایا تھا۔



اس تصویر کا اتمام مسیح میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی ایک کامل انسان کہا جا سکتا ہے۔ اُس کی انسانی زندگی کے ہر زمانے میں ہم اُسے کامل پاتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ خدا کے ساتھ پوری رفاقت رکھتا تھا۔ اسی سبب سے وہ کہہ سکتا تھا کہ "میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں" (یوحنا ۴: ۳۴) علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح کی ذات کی طرح خدا کی ذات کا لازمی خاصہ محبّت ہے۔ اسی طرح مسیح میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں انسان کا بھی لازمی خاصہ محبت ہے۔ لہٰذا ہم اپنی ذات کی حقیقت کو اسی وقت پورے طور پر سمجھ سکتے ہیں جب کہ ہم بھی محبّت کرنا سیکھتے ہیں۔

بہرحال جب ہم اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حقیقی حالت نہایت متفرق معلوم ہوتی ہے۔ ہم نہ خدا اور دنیا کے ساتھ صلح رکھتے ہیں اور نہ اپنے ہی ساتھ۔ ہمارے کام جنہیں ہمارے ارتقار کا موزوں وسیلہ ہونا چاہیئے ہمارے لئے ناگوار بن جاتے ہیں جن سے رہائی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں ہمارے دن گزرتے جاتے ہیں محبت میں ترقی کرنے کے بجائے ہم رقابت اور جلاپا (حسد) زیادہ سیکھتے جاتے ہیں۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ خدا کی مرضی ہماری غذا ہے ہم اکثر اس پر عمل کرنا پسند نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ خدا کے ساتھ صلح رکھیں، ہم اس سے سرکشی کرتے اور زندگی سے نفرت کرتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ہم مجبور ہو کر خدا کی مرضی کو اس حالت میں قبول کرتے ہیں، جب خود ہماری مرضی کسی صورت سے پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

مختصراً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گناہ کے سبب سے ہمارے خدا کا جو مقصد ہے اس میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ مقدّس یوحنا کا قول ہے کہ "گناہ بغاوت ہے" (۱ یوحنا ۳: ۴) اور اس امر کی اصلی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

خدا کی مرضی سے انکار کرنا اور اپنی خواہشات پر چلنا گناہ کہلاتا ہے۔ جسے ہم سرکشی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یوں گناہ ہمارے ارادے کا ذاتی فعل بن کر الہٰی مقصد کی مخالفت کرتا ہے۔ اسے محض جہالت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگرچہ جہالت گناہ میں ایک بڑا حصہ رکھتی ہے۔ تاہم گناہ کرنے کے بعد جو خطاواری، شرمندگی اور ندامت ہم محسوس کرتے ہیں۔ وہ محض جہالت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ وہ ایسی جہالت نہ ہو جسے ہم سزا اور ملامت کے قابل کہہ سکیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ موقع ملنے پر بھی ہم نے حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ دراصل ہم سب کی زندگیوں میں ایسے موقعے آ چکے ہوں گے جب کہ ہم جانتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے لیکن ہم نے اس کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اگر ہم صدقِ دل سے غور کریں تو ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی میں گناہ کی حقیقت کو پہچان سکتا ہے۔ جس حال کہ ہم دوسروں کی خطاؤں کے لئے عذر پیش کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے لئے کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے۔

بہرکیف گناہ اُن بُرے اعمال سے جو ہم وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں، زیادہ گہرائی رکھتا ہے۔ اولاً وہ ہماری اور ہمارے ارادوں کی اندرونی کیفیت ہے اگرچہ ہم کسی بُرے کام کو ضبط بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً غصہ کرتے وقت اپنے مُنہ سے سخت سست الفاظ نہیں نکالتے، تو ایسا کرنا ہمیں آسان نہیں معلوم ہوتا۔ فطری طور پر یا بلا دقت اُٹھائے ہم بُردباری بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ گناہ کرنے کی طبیعت ہمارے اندر ہمیشہ موجود رہتی ہے جسے مغلوب کرنا ضروری ہے۔

ثانیاً انسان کا ایک اجتماعی گناہ بھی ہے، جسے زیرِ نظر رکھنا چاہیئے۔ کل بنی نوع انسان نے خدا کی مرضی پر چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور ہم رفتہ رفتہ محسوس کرتے جا رہے ہیں کہ اس اجتماعی گناہ میں ہم کس قدر زیادہ پھنستے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اس سے رہائی پانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی گناہ کے سبب سے جنگ پیدا ہوتی ہے۔



کسی ایک شخص پر الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ انسان ہی کی سرکشی کے سبب سے الہٰی صلح و سلامتی اب تک دنیا میں قائم نہیں ہوتی۔ یا ایک اور مثال پر غور کیجیے، اہلِ صنعت و حرفت کے باہمی تعلقات میں انسانی خود غرضی کے سبب سے تلخی اور رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگرچہ کارخانوں کے مالک و مزدور اکثر خود غرض نہیں ہوتے تو بھی ان کا انسان کی اجتماعی خود غرضی کے اثر سے بچنا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے کو صدق دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو گناہ ہماری فطرت کا ایسا عنصر نظر آئے گا جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

جب کبھی ہم کسی عالمگیر واقعہ پر غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس کا کوئی عالمگیر سبب بھی ضرور ہو گا۔ اسی طرح گناہ کا بھی ایک ایسا سبب ہے جو کُل بنی نوع انسان پر حاوی ہے۔ جس کو اصطلاحاً "فطری معصیت" کہتے ہیں۔ فطری معصیت سے مراد یہ ہے کہ ہمارے والدین کی نسلی وراثت اور ہماری زندگی کے ماحول کے سبب ہم بذاتِ خود خدا کے مقصدوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس خیال کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ وہ چیزیں جس سے ہم اپنا کام شروع کرنا چاہتے ہیں اُن کو نقصان پہنچ چکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے لئے بُرے کام کرنا اچھے کاموں کی بہ نسبت زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اور اگر کبھی اچھے کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو اُن کو عمل میں لانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگرچہ گناہ کی عالمگیری ہم کو یہ بتاتی ہے کہ انسان فطری معصیت رکھتا ہے۔ تاہم ہمیں اس غلطی میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ ہماری فطرت قطعی طور پر ناقص ہو چکی ہے۔ کیونکہ انسان میں اب تک بہت کچھ اچھائی موجود ہے جس کے ذریعے سے خدا اُس کو بچا سکتا ہے۔ مسیح اس اچھائی کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا، اور تجربہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ والدین جو اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان والدین کی بہ نسبت جو لاپرواہ ہیں، اپنے بچوں

کو نیک بننے میں زیادہ مدد پہنچا سکتے ہیں۔

اب تک ہم اس مفروضے کو مانتے آئے ہیں کہ انسان آزاد قوتِ ارادی کا مالک ہے، ورنہ جو کچھ ہم اب تک کہتے آئے ہیں بے معنی ہوگا اور در اصل اگر ہم میں قوتِ ارادی موجود ہوتی گناہ کے تصوّر میں کوئی حقیقت نہ ہوتی۔ پس اب ہم اپنی اس تحقیق کے ایسے موقع پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں قوتِ ارادی کے تصوّر پر کچھ دیر غور کرنا چاہیئے۔ فی زمانہ بہت لوگ انسانی ارادہ کی آزادی کے منکر ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ خصوصیات جو ہم اپنے والدین سے ورثے میں حاصل کرتے ہیں اور وہ واقعات جو ہماری زندگی پر گزر چکے ہیں اور وہ حالات جو کسی خاص موقع پر ہم پر اثر کرتے ہیں، انھیں چیزوں سے ہمارے خصائل و اعمال متعین ہوتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ یہ سب باتیں ہمارے ارادہ اور ہماری قوتِ انتخاب کو محدود کر دیتی ہیں جس کے سبب سے ہم ہر موقع پر اپنی مرضی کو پورا کرنے کی مکمل آزادی نہیں رکھتے۔ چونکہ ہر قوم اور ہر سوسائٹی اپنی اپنی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری خصالت پر ہماری نسل اور ماحول کا کس قدر اثر پڑتا ہے اور ہم سب اپنے تجربے سے معلوم کرتے ہیں کہ ہم اکثر ان کاموں کو نہیں کر سکتے جنھیں ہم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہماری گزشتہ زندگی ایسی رہی ہے، جس کے سبب سے ایسے کام ہو نہیں سکتے۔ ہم ایسی لامحدود آزادی نہیں رکھتے کہ ہر موقع پر اپنی ہی مرضی کے مطابق کام کر سکیں۔ لیکن اس بیان میں قوتِ ارادی پر زور دینے کا یہ مقصد نہیں کہ ہماری قوتِ ارادی لامحدود ہونی چاہیئے۔ اولاً ہر قسم کی آزادی قوانین کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے۔ جب تک موٹر چلانے کے قاعدوں کا خیال رکھا جاتا ہے اس وقت تک موٹر کار اپنا کام پورا کرنے میں آزاد رہتی ہے۔ مثلاً اگر ایک موٹر ڈرائیور تیل استعمال کرنے



سے انکار کرتا ہے تو اس سے اُس ڈرائیور کی آزادی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ موٹر کار چلانے کی آزادی کھو بیٹھتا ہے۔ کیونکہ تیل نہ استعمال کرنے کے سبب سے موٹر کار چلائی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح خدا کی مرضی کی مخالفت کرنے سے ہماری آزادی ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسا کرنے سے ہم اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اپنی زندگی کے حقیقی مقصد کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح یہ سچ ہے کہ خدا کی غلامی کامل آزادی ہے۔

جب ہم اپنی زندگی پر اور دوسروں کی زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کا تعلق ہماری نسل اور ہمارے ماحول اور وقتی حالات سے ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اپنی ذمہ واری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور اپنے ہر ایک کام کی ذمہ واری محسوس کرتے ہوئے یہ کہنا لازمی ہوگا کہ "فلاں کام میں نے کیا ہے اور میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں"۔ ہم نسلی خامیوں وغیرہ کی بنا پر اپنے ضمیر کو خاموش نہیں کر سکتے۔ ہم ایسے شخص کو ملامت نہیں کرتے جو مجبوراً ایسے حالات میں رہتا ہے جن سے وہ دق یا کوڑھ کے مرض کا شکار بن جاتا ہے۔ مگر ایسے شخص کو ضرور ملامت کرتے ہیں جو چوری کرتا ہے۔ چاہے اس کی زندگی کے حالات اس کو چوری کرنے پر کتنا ہی مجبور کرتے ہوں۔ کیوں کہ ہمارا یہ یقین ہے کہ وہ اپنی ابتر حالت سے نکل سکتا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ نسل، ماحول، وقتی حالات اور گزشتہ واقعات سے ہماری زندگی کا میدانِ کارزار معیّن ہوتا ہے مگر وہ فتح کا یقین نہیں دلا سکتیں۔ وہ تمام باتیں ہمارے سامنے کچھ آزمائشیں حائل کرتی ہیں اور کچھ آزمائشوں سے ہم کو بچاتی بھی ہیں۔ مثلاً ایک بھوکا آدمی جو دھن دولت نہیں رکھتا چوری کرنے کی آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ لیکن ودھیگیتوں کے سر کچلنے کی آزمائش سے بری رہتا ہے۔ اگرچہ ہم ان آزمائشوں کے ذمہ دار نہ ہوں جن سے ہمیں دو چار ہونا پڑتا ہے۔ تاہم

جس طریقے سے ہم اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہماری ہی ذمہ داری ہے اور اس بات میں بھی کہ ہم ان آزمائشوں پر غالب آسکتے ہیں یا نہیں۔ کوئی دلیل ہمیں اس بات پر قائل نہیں کرسکتی کہ ہم اس ذمہ داری سے بری ہیں۔

انسانی قوتِ ارادی کو الٰہی قدرت، علم و ارادہ کے ہم آہنگ بنانے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ اس مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتی ہے اور ہم اپنے عام تجربے میں دیکھتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ہمیں دو باتوں کو خیال میں رکھنا پڑتا ہے جن میں موافقت قائم کرنا یا اُن کے باہمی تعلق کو پہچاننا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا اس دنیا کا فرماں روا ہے اور یہ بھی کہ وہ اکثر ہمارے خیالات اور اعمال مسترد کر دیتا ہے، تاکہ اس کا مقصد پورا ہو، اور ہم یقین جانیں کہ بالآخر کوئی طاقت اس کے مقصد کو باطل نہیں کرسکتی۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ہم اس کی مرضی کی مخالفت نہیں کرسکتے" یا اس کی مرضی کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا نے ایسی ہستیوں کو بنا کر جو قوتِ ارادی رکھتی ہیں اپنی قدرت پر حد بندی مقرر کی ہے۔ صرف اس صورت سے انسان اس کامل زندگی تک پہنچ سکتا ہے جو خدا نے اس کے لئے معیّن کی ہے۔ یعنی فرمانبرداری کی طبیعت اور خدا کے ساتھ تعاون کرنے کے ذریعے سے۔ بہرحال خدا حکمراں ہے اور ہم یقین رکھیں کہ وہ اپنا مقصد پورا کرتا جا رہا ہے۔ لیکن خدا آدمیوں ہی کے ذریعے سے اپنا کام کرتا ہے، اور جب وہ اس کی پکار کو نہیں سنتے تو وہ کسی دوسرے وسیلے کا انتظار کرتا ہے۔ جب ہم خود اپنی زندگی پر غور کرتے ہیں تو اس میں خدا کے قوی ہاتھ کو پہچان سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اپنی اخلاقی ذمہ داری کو بھی بخوبی محسوس کرتے ہیں۔



ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہماری مرضی پورے طور پر آزاد نہیں کہی جاسکتی۔ اگرچہ ہم اچھی خواہشات رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اچھی طبیعت بھی رکھتے ہیں۔ تاہم اس میں ہمیشہ بدی مخلوط رہتی ہے۔ اس کے سبب سے ہمارے اندر ایک قسم کی کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ ہماری عقل، ہماری خواہشات اور ہمارے ارادوں کے درمیان تصادم جاری رہتا ہے۔ کسی ایک جزو میں اتحاد نظر نہیں آتا۔ ہمارے اندر کثرت سے متضاد خواہشیں کام کرتی رہتی ہیں جن سے ہمارے ارادے بھی درہم برہم ہوجاتے ہیں۔ ہمارا ایمان اور ہمارے شکوک و شبہات آپس میں جنگ کرتے رہتے ہیں اور صحیح اور حقیقی آزادی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ ہم پورے طور پر خدا کی مرضی کے پابند نہیں بن جاتے۔

جب ہم اپنی زندگیوں پر صدق دل سے غور کرتے ہیں تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ گناہ کی طاقت کس قدر زبردست ہے۔ جس سے ہماری عمدہ ترین اور پاکیزہ قوّتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم خود اپنی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ گناہ جو ہماری زندگی کو تباہ کر رہا ہے ہماری ذات کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ ہم گناہ سے اس قدر نفرت نہیں کرسکتے جس قدر خدا کو اس سے نفرت ہے کیونکہ گناہ ہماری ہی مطلق العنان مرضی ہے۔ اگر اس کا کوئی صحیح علاج ہوسکتا ہے تو وہ ایسا علاج ہونا چاہیئے جو ہمارے باطن میں کام کرے اور ہماری مرضی کو بالکل بدل ڈالے۔ ایسا علاج صرف کسی بیرونی طاقت سے آسکتا ہے۔ کیونکہ ہم خود ایسی کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ غرضکہ ایسا علاج خدا سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ہماری زندگی قطعی طور پر تبدیل ہوسکتی ہے۔ ایسا علاج زبور نویس کی اس فریاد کا جواب ہے کہ "اے خدا میرے اندر ایک نیا دل پیدا کر!" (زبور ۵۱ : ۱۰)

# باب ششم

## مغفرت

خدائے اقدس ہو ممدوح — کل خلقت میں ہر بار
ہیں اُس کے سارے قول عظیم — کام اُس کے پائیدار

دیکھ الفت حکمت سے معمور — انسان جو تھا مغلوب
دوبارہ لڑکر دشمن سے — ہے غالب آیا خوب

اور بخششِ فیض سے بیش بہا — ہر مومن لیتا ہے
اپنی حضوری اور حیات — رب بخشیدہ میں دیتا ہے

گناہ لازمی طور پر انسانوں میں جدائی پیدا کرتا ہے۔ چونکہ گناہ ہماری ارادی کیفیت ہے، جس کے سبب سے خدا کی پُر محبت مرضی کے بجائے ہم اپنے منصوبوں اور ارادوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لئے گناہ کے سبب سے لوگوں کے باہمی تعلقات کا منقطع ہو جانا لازمی بات ہے۔ جب ہم دنیا کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ قوموں کے درمیان نا اتفاقی





پائی جاتی ہے۔ لوگوں کی ایک جماعت دوسری جماعت کی مخالفت کرتی ہے۔ بلکہ مسیحی کلیساؤں میں بھی پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم متحد ہو کر کل بنی نوع انسان کے عام دشمنوں کا مقابلہ کریں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان حسد، رشک اور عداوت پائی جاتی ہے جس کے سبب سے ہم ایک دوسرے سے تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی قوتوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان فرداً فرداً بھی یہی حالت ہے۔ اگر ایک دوکاندار ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے ہم سے دغابازی کرتا ہے تو ہم اس پر اعتبار نہیں کرتے اور اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے ہیں۔ یعنی ہم اس سے پھر کوئی چیز نہیں خریدتے۔ اسی طرح اگر ایک شخص جس کے ساتھ ہمارا زیادہ نزدیکی تعلق ہے یعنی اگر ہمارا دوست ہم سے بُرائی کرتا ہے تو ہماری دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ہمارا برتاؤ اُس کے ساتھ پہلا سا نہیں رہتا۔ (ان مثالوں میں ہم یہ فرض کر رہے ہیں کہ جو باتیں انسانی تعلقات کو بگاڑتی ہیں وہ چھوٹی چھوٹی خطائیں نہیں ہیں بلکہ ایسے جرائم ہیں جو ان تعلقات کے لئے نہایت مہلک ہیں)۔ اسی طرح جب ہم گناہ کرتے ہیں تو ہمارا اور خدا کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ خدا ہم سے بے انتہا محبت کرتا ہے وہ ہمارے گناہ کو گوارا نہیں کر سکتا۔

گناہ کا لازمی نتیجہ جدائی اور انسانی تعلقات کا ٹوٹنا ہے۔ جن کا دوبارہ قائم کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اُس دوکاندار کو معاف کرنا اور اُس سے پھر سودا خریدنا مقابلتاً آسان ہے۔ لیکن کسی دوست کے ساتھ دوبارہ رفاقت قائم کرنا جس نے ہمارے ساتھ غیر معمولی بدی کی ہے نہایت مشکل ہے اور نہ ہی اس پر دوبارہ پورے طور سے اعتبار کرنا آسان ہے۔ اسی لئے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نکاح کے فریقین میں سے اگر ایک بیوفائی کر کے دوسرے کے حق میں گناہ کرتا ہے تو ان کا باہمی رشتہ

دوبارہ قائم کرنا قریب قریب غیر ممکن ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُنکی
ابتدائی محبت اور اعتبار بالکل جاتا رہا ہے جو پھر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ انسان
کا سب سے قریبی رشتہ خدا کے ساتھ ہے اور جب وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔
تو اسے دوبارہ قائم کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ایسی بیگانگی جب دو شخصوں کے درمیان حائل ہو جاتی
ہے تو اُس کا اثر دونوں پر پڑتا ہے۔ جس طرح ہم اُس شخص پر جس نے ہمارے
ساتھ بدعنوانی کی ہو پہلے کی طرح بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہم بھی اس
دوست کی نزدیکی دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے جس کے ساتھ خود ہم نے بدی
کی ہو۔ کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم مختلف راستوں پر چل رہے ہیں اور
جب تک ہم اس حالت کو صدق دلی سے نہیں دیکھتے ہمارے دلوں میں ایک
دوسرے کے لئے ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی جو باہمی رفاقت کے لئے ضروری
ہے۔ ہمدردی کی کمی تو کسی قسم کی نا اتفاقی میں نظر آ سکتی ہے۔ لیکن سب سے
زیادہ اس کی کمی اخلاقی نا اتفاقی میں نظر آتی ہے۔

یہ رشتہ صرف اس حالت میں بحال ہو سکتا ہے جبکہ مجرم اپنی غلطی کو
محسوس کرے اور اس کے لئے اس قدر افسوس کرے کہ اس کے دل میں اپنے
گناہ کے لئے نفرت پیدا ہو جائے اور اپنی زندگی یوں بدل ڈالے کہ اُس میں
بُرے فعل کی خصلت بالکل باقی نہ رہے۔ جب وہ توبہ کر کے اپنی زندگی کو
بدل ڈالتا ہے تو وہ ابتدائی رفاقت از سر نو قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے
باوجود چند اور شرائط کی بھی ضرورت ہے۔ ایسے شخص کو معافی قبول کرنے
کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اس دوسرے شخص پر اعتبار کرنا چاہیئے جس سے
وہ معافی کا آرزومند ہے۔ علاوہ ازیں مجروح کو معاف کرنے پر مستعد رہنا



چاہیئے۔ انسانی تعلقات میں جب ہم ایسا طرزِ عمل دیکھتے ہیں تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ مجرم
صرف اس حالت میں معافی کی امید رکھ سکتا ہے اور توبہ کی طبیعت حاصل کر سکتا ہے
جبکہ مجروح اس کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اس کے گناہ کی شرم و ندامت میں خود
شریک ہونے پر تیار ہو۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ جب کبھی کوئی شخص کسی مہلک گناہ میں پھنس
جاتا ہے تو اُس کی اپنی زندگی کی اصلاح اور دنیا کے ساتھ اُس کے تعلقات کی
اصلاح اُس حالت میں ہو سکتی ہے جب کہ کوئی ایسا نیک شخص مثلاً اُس کی ماں یا بیوی
جو اس سے محبت رکھتی ہے اس کے گناہ کے بوجھ اور ندامت میں اس کے ساتھ
شریک ہو جس سے اُس کے دل میں توبہ کی تحریک پیدا ہو سکے اور وہ اپنی زندگی میں
بہتر چیزوں کا آرزومند بن سکے۔

گناہ کی معافی کے تجربے پر غور کرنے سے ہم ایک اور حقیقت سے روشناس
ہوتے ہیں جو معجزۂ مغفرت کا سب سے حیرت انگیز عنصر ہے۔ جب کوئی شخص کسی
گنہگار کو معاف کرنے کی غرض سے اس کی مصیبت، ندامت اور پشیمانی میں شریک
ہوتا ہے اور گنہگار اپنے گناہ کو محسوس کرتا حقیقی توبہ کرتا اور اپنے محبت کرنے والے
پر اعتبار کرتا اور معافی قبول کرتا ہے تو نہ صرف ان دونوں کا ابتدائی رشتہ دوبارہ
قائم ہو جاتا ہے بلکہ وہ رشتہ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ معاف کرنے اور معاف کئے
جانے کے تجربے سے دو شخصوں کا باہمی تعلق زیادہ گہرا اور لطیف بن جاتا ہے معافی
محض ایک منفی شے نہیں ہے جس سے گذشتہ خطائیں منسوخ ہو جاتی ہیں، بلکہ ایک تخلیقی
قوّت ہے جس سے باہمی تعلقات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اُن دونوں شخصوں
کی محبت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بہرحال اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ چونکہ گناہ بھلائی کا وسیلہ ہے اس لئے
گناہ سے قطعی طور پر تاسف نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن جس شخص نے معافی کا فی الواقع تجربہ

حاصل کر لیا ہو، کبھی یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ گناہ کرتے رہنا چاہیئے تا کہ "فضل زیادہ ہو" (رومیوں ۶ : ۱)۔ اگرچہ معافی کے ذریعے باہمی رشتہ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن اس رشتہ کی گہرائی جو کامل یگانگت سے پیدا ہوتی ہے اور جس میں جدائی کا کوئی اثر نہیں ہوتا مقابلتًا زیادہ پسندیدہ ہے۔ معافی فعل گزشتہ کی ماہیت کو بدل ڈالتی ہے اور معاف کرنے والے کی بابت نئی واقفیت حاصل کر کے ہم پہلے کی نسبت اس کے اور زیادہ نزدیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ قربت اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو بغیر گناہ کئے حاصل ہو سکتی ہے۔ گذشتہ گناہ کی پشیمانی ہمیشہ قائم رہتی ہے، جو ہمیں گناہ کو ایک معمولی چیز خیال کرنے سے متواتر روکتی رہتی ہے۔

اس بیان میں سزا کی نسبت کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ کیونکہ دراصل معافی کو سزا کے چھٹکارے سے کوئی سروکار نہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی نرم دلی، بے پروائی، یا موقع نہ حاصل کرنے کی وجہ سے مجرم کو سزا نہ دیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے اُسے معاف کر دیا۔ چنانچہ داؤد نے ابی سلوم کو سزا دینے سے تو گریز کیا لیکن اُسے معاف نہیں کیا۔ کیونکہ جب اس نے ابی سلوم کو یروشلم واپس آنے کی اجازت دی تو اُسے دیکھنے سے انکار کیا (۲ سموئیل ۱۴ : ۲۴)۔ اسی طرح ہم مجرم کو معاف کرنے کے باوجود سزا دے سکتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کو اس لئے سزا دیتا ہے کیونکہ وہ اُسے معاف کرنے کو تیار ہے، بلکہ اسے معاف کرنے کا آرزومند ہے۔ (عبر ۱۲ : ۵ وغیرہ)

مسیح کے کام کی تشریح میں جو مختلف صورتوں میں کی گئی ہے سزا کا تصوّر کافی حد تک شریک کیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں سزا کے مسئلہ پر کچھ دیر اور غور کرنا چاہیئے۔ سزا کی نسبت چار قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا



بالکل فطری ہے۔ یعنی سزا گناہ کا معاوضہ ہے۔ چونکہ خطاکار نے کسی دوسرے شخص کو تکلیف پہنچائی ہے، اس لئے اسے بھی تکلیف سہنی چاہیئے۔ لیکن مسیح نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ خدا کے متعلق اس قسم کا خیال اپنے دل سے بالکل نکال دینا چاہیئے۔ کیونکہ "خدا اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور بدوں دونوں پر مینہ برساتا ہے"۔ (متی ۵ : ۴۵)۔ ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ انتقام اخلاق کی رو سے ناجائز ہے اور یہ جو ہمارے لئے جائز نہیں۔ وہ خدا کے لئے ہرگز بجا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں جب ہم مسیح میں خدا کو کام کرتے اور اپنی ذات کو ظاہر کرتے دیکھتے ہیں تو ہم معلوم کرتے ہیں کہ گناہ کی نسبت اس کا یہ رویّہ نہیں ہو سکتا۔

سزا کی نسبت دوسرا خیال سزا کے اثر سے جو دوسروں پر پڑتا ہے تعلق رکھتا ہے۔ سزائے موت جو حکومت کی طرف سے عائد کی جاتی ہے، وہ محض اسی بناء پر حق بجانب ثابت کی جا سکتی ہے کہ اس کا اثر دوسروں پر پڑے۔ اس قسم کی سزا کی نسبت یہ سمجھنا کہ اس میں الٰہی سزا کا پورا مفہوم پایا جاتا ہے درست نہیں معلوم ہوتا خصوصًا اس وجہ سے کہ اس سزا سے دل کی تبدیلی نہیں ہو سکتی جسے خدا طلب کرتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خوف کا اثر ہمارے اعمال پر پڑے۔ لیکن دراصل اس سے انسانی زندگی اور ارادہ میں تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ جس طریقہ سے خدا انسان کے گناہ سے پیش آتا ہے، اس میں سزا کا یہ دوسرا تصوّر ایک چھوٹا حصّہ رکھتا ہو مگر یہ اس کا ایک بڑا عنصر نہیں کہا جا سکتا۔

سزا کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ خطاکار اس کے ذریعے سے اپنی خطا کو محسوس کر کے توبہ کرے جو اس کے پچھتاوے کا وسیلۂ اظہار بن جائے۔ اگر جب ہم اپنی خطا کو محسوس کرتے ہیں تو اس کے لئے تکلیف سہنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ہمارا افسوس ظاہر ہوتا ہے۔ جس طریقے سے خدا ہمارے ساتھ پیش آتا ہے اس میں

سزا کا یہ مقصد موجود رہتا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، خدا ہمیں سزا اسی لئے دیتا ہے، کیونکہ وہ ہمیں معاف کرنا چاہتا ہے۔ اس بات کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ اس قسم کی سزا معافی کے بعد بھی عائد کی جاتی ہے اور تعلیم و ترتیب کے ہر اصول کے لئے فائدہ مند اور لازمی ہے۔ لیکن اس قسم کی سزا کو گناہ کا اجر نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ہی اُسے گناہ کی مزدوری سمجھنا چاہیئے۔ اگر اس کی نسبت یوں خیال کیا جائے تو وہ گناہ کا بدل بن جاتی ہے اور اس کی تربیت کُن کیفیت جاتی رہتی ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں مان سکتے کہ ہمارے خداوند نے اسی قسم کی سزا ہمارے واسطے گوارا کی جس طریقہ سے خدا ہمارے ساتھ پیش آتا ہے اُسے سمجھنے کے لئے سزا کے اس تصور سے ضرور تھوڑی بہت مدد مل سکتی ہے۔ لیکن مسیح کی اذیت کے مقصد کو سمجھنے کے لئے اس سے مدد نہیں مل سکتی۔

سزا کے بارے میں چوتھا خیال یوں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے سزا کا مفہوم اس طرح بدل جاتا ہے کہ اسے سزا کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بعض اوقات ہم کسی فعل کے فطری نتیجوں کو سزا کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک شخص آگ کے شعلے میں اپنی اُنگلی ڈال دے تو انگلی کا جل جانا اس کی سزا ہوگی۔ اسی طرح گناہ کے بھی فطری نتیجے ہوتے ہیں جن سے درد پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کے نتیجے معافی کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے بے پروائی سے اپنی صحت خراب کر لی ہو تو معافی حاصل کرنے کے بعد وہ شخص فوراً یا مکمل طور پر تندرست نہیں ہو سکتا اور نہ ہم اُس پشیمانی کو بھول سکتے ہیں جو بُرے افعال اور سالوں کے برباد ہونے کے سبب سے ہمیں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے زیادہ مہیب بات یہ ہے کہ اپنی گناہ آلودہ زندگی کے اثر سے دوسروں کو بُرائی کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس سے اُن کے گناہ کا بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے اور بھاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی اذیت پر بھی معافی کا اثر



پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سے کم از کم ہماری حقیقی خودداری دوبارہ بحال ہو جاتی ہے (جو خود اعتمادی سے بہت فرق ہے)۔ اس سلسلے میں خیال رکھنا چاہیئے کہ گناہ کا یہ فطری نتیجہ دوسرے لوگوں پر بھی جو معصوم ہیں اثر کرتا ہے۔ مثلاً ایک شرابی کی تکلیف صرف اسی حد تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس کی بیوی اور بچوں کو بھی تکلیف جھیلنی پڑتی ہے۔ گناہ کے بوجھ کو گوارا کرنا بالخصوص روحانی اذیت کا بوجھ ان لوگوں کے لئے از حد بھاری ہوتا ہے، جو ہمیں سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ محبت کرنے والا جس قدر نیک اور پاک دل ہوگا اسی قدر یہ بوجھ اسے زیادہ بھاری محسوس ہوگا۔ اسی لئے گناہ کی ندامت کا احساس ایک گنہگار بیٹے کی بہ نسبت اس کی ماں کو زیادہ ہوتا ہے۔ اس بات سے ہمیں مسیح کی اذیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ چونکہ خدا ہم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس لئے ہمارے گناہوں کا دُکھ درد اس کے لئے سب سے زیادہ بھاری ہے۔ صلیب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ گناہ خدا کے لئے کیا معنی رکھتا ہے۔ جب ہم اس تکلیف کو دیکھتے ہیں جو ہمارے گناہ کے سبب سے ان لوگوں پر پڑتی ہے جو ہم سے بے انتہا محبت کرتے ہیں تب ہم اپنے گناہوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک گنہگار انسان کے بچنے کی اُمید صرف اس بات پر ہے کہ اس کی ماں یا بیوی اس کے گناہ کی اذیت گوارا کرنے پر تیار ہو جائے، اس کی ندامت کو اپنے اوپر اُٹھا لے، اور ان تمام باتوں کا مقابلہ کرے جن سے اُسے فطرتاً نفرت ہے۔ مسیح کی صلیبی موت میں خدا نے مسیح میں ہو کر ہمارے واسطے یہی کام سرانجام دیا ہے۔

اب ہم مسیحی مذہب کے عقیدۂ مغفرت کو کسی قدر سمجھ سکتے ہیں جو شروع سے مسیحی بشارت کا مرکزی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ مسیح کی موت کے وقت سے لوگوں نے اپنے تجربے سے معلوم کیا ہے کہ اس کی

موت سے ان کے گناہ معاف کئے جاتے ہیں۔ ابتدائی کلیسیا کا بھی یہی تجربہ تھا اور فی زمانہ بھی ہزارہا لوگ جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا یہی تجربہ رکھتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارا گناہ ہمیں خدا سے جُدا کر دیتا ہے۔ مگر صلیب کے ذریعے سے خدا نے گناہ کی دیوار کو توڑ کر ہمیں اپنے ساتھ پھر ایک کر لیا۔ ہم نے یہ بھی معلوم کیا کہ ہمیں یہ تجربہ مسیح کے دُکھ اور موت سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگ اس تجربے کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کفّارے کے مختلف نظریئے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی تشریحیں خاطر خواہ ثابت نہیں ہوئیں۔ ان لوگوں کے بیانات اور ہمارا اُن سے مطمئن نہ ہونا دونوں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مسیح میں خدا ضرور گناہ معاف کرتا ہے اور یہ ہماری روحوں کے لئے سب سے اہم بات ہے۔

جس وقت مسیح عماؤس کی سڑک پر دو شاگردوں پر ظاہر ہوا تھا (لوقا ۲۴: ۱۳-۱۵) تو اس نے ان شاگردوں کو اپنی اذیت کے معنی بتائے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس نے اپنی اذیت کی کیا تفسیر کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کو اپنے انداز خیال اور تجربہ کے مطابق اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ہم اس مسئلہ کو کبھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ مسیح کا وہ بیان صرف پہلی صدی کے یہودیوں کے لئے تھا۔ ہمیں دوسرے طرز بیان کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی اذیت کے بنیادی معنی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں گزشتہ زمانے کے تصوّرات کو ضرور استعمال کرنا چاہیئے، اور اگرچہ تمام تصوّرات ناکافی ہیں تو بھی اُن سے سچائی کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کفّارہ کی سچائی ہمارے ذاتی تجربے میں کس طرح کام کر رہی ہے۔

اس مسئلہ کو بیان کرنے کے لئے نئے عہدنامے میں دو اہم خیالات سے



کام لیا گیا ہے۔ پہلا خیال نجات کے تصوّر یا استعارہ میں نظر آتا ہے۔ اس امر کو سمجھنے کے لئے ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کبھی اہل یہود کسی تمثیل کو استعمال کرتے تھے تو ذریعۂ تمثیل پر نہیں بلکہ صرف اس کے نتیجہ پر غور کرتے تھے۔ عہدنامہ عتیق میں بیان آیا ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو مصر سے نجات بخشی۔ یہ اس لئے کہ اس نے ان لوگوں کو غلامی سے آزاد کر دیا تھا۔ اور غلامی سے رہا کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ فدیہ (یعنی قیمت) دے کر غلام کو واپس لے لیا جاتا تھا۔ لیکن جب خدا بنی اسرائیل کو رہا کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ خدا مصریوں کو کچھ رقم یا معاوضہ ادا کرے، ہم یہ پڑھتے ہیں کہ مصری لوگ خود بنی اسرائیل کو سونا چاندی اور کپڑے دیتے ہیں (خروج ۱۲: ۳۵، ۳۶)۔ اسی طرح عہدنامہ جدید میں ہماری نسبت اکثر یہ بیان آتا ہے کہ ہم گناہ کی غلامی میں بندھے ہوئے تھے۔ لیکن مسیح کی صلیب کے وسیلے سے ہمیں آزادی بخشی گئی۔ یعنی گناہ کی غلامی سے چھڑائے گئے۔ اگرچہ بعض معنوں میں یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے گناہوں کی قیمت ادا کی گئی۔ لیکن اس تمثیل میں یہ سوال ضروری نہیں ہے کہ یہ قیمت کس کو ادا کی گئی۔ ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ کفّارہ کی محض اس تمثیل کی رو سے عہدنامہ جدید میں یہ بیان آیا ہے کہ مسیح نے ہمارے بدلے اپنی جان دی (متی ۲۰: ۲۸؛ مرقس ۱۰: ۴۵؛ ۱ تیموتھ ۲: ۶)
اور مقاموں پر یہ فقرہ آیا ہے کہ اس نے "ہمارے فدیہ میں" اپنی جان دی۔ پچھلی فصل میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ گناہ ہماری آزادی کو محدود کر دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے ارادوں کی آزادی حاصل کرنی ہے اور یہ مسیح کے کام کا اہم جزو ہے۔ صلیب کے ذریعے سے مسیح ہمارے گناہوں کی بیڑیوں کو توڑ ڈالتا ہے اور ہمیں آزاد کر دیتا ہے۔ "پس اگر بیٹا تمہیں آزاد کرے گا تو تم واقعی آزاد ہو گے" (یوحنا ۸: ۳۶)۔

دوسری زبردست مثال جوہمیں عہد نامۂ جدید کے ہر حصہ میں ملتی ہے قربانی کا تصوّر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر حصّے میں قربانی کی رسم پائی جاتی ہے —

اگرچہ قربانی کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں اور عموماً پرستار اپنی قربانیوں کا مقصد صاف طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ تو بھی قربانی کی نسبت چند ایسے عام خیالات ہیں جو ہر جگہ یکساں ہیں۔ اوّلاً ہر شخص یہ مانتا ہے کہ خدا کے حضور قربانی گزراننا انسان کا فرض ہے اور یہ بھی کہ قربانی کے ذریعے خدا کے ساتھ انسان کا اتصال قائم ہو سکتا ہے۔ اگر خدا سے تعلق ٹوٹ جائے تو قربانی اس تعلق کو دوبارہ قائم کر سکتی ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ قربانیوں میں قربان کئے جانے والے جانور کی جان خاص اہمیت رکھتی ہے، اور اس کی موت قربانی کی محض غیر ضروری لوازمات میں سے ایک ہے۔ نائیجیریا (Nigeria) کے بعض حصّوں میں قربانی کے جانور کی جان نکلنے سے پہلے ہی اس کا خون نذر کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض موقعوں پر اسے مرنے سے بچا لیا جاتا ہے۔ تاکہ اسے کسی دوسرے موقع پر پھر نذر کیا جا سکے۔ عام طور پر اور بالخصوص عہد نامۂ عتیق میں قربانی انسان کی بنائی ہوئی رسم نہیں سمجھی جاتی بلکہ نذر گذارنے کا ایسا ذریعہ سمجھی جاتی ہے جو خدا کی طرف سے مقرّر ہوئی ہے۔ لیکن مسیحیوں نے یہ معلوم کیا کہ جس اتصال کے وہ آرزومند تھے اور جسے وہ حاصل نہ کر سکے، اُسے مسیح نے فی الحقیقت صلیب پر اپنی جان نذر گذران کر قائم کر دیا۔ اسی لئے مسیحیوں کا یہ قول ہے کہ مسیح کی قربانی ایک پوری اور کامل قربانی ہے اور یہ بھی کہ مسیح کے خون سے وہ بچائے گئے۔ یعنی اس کی جان کی قربانی کے وسیلے سے جو موت کے ذریعے گذرانی گئی تھی۔

جب ہم مسیح کے کام پر غور کرتے اور اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔



تو ہمیشہ اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ مسیح میں خدا اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے: "خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا"۔ (۲ کرنتھ ۵ : ۱۹) "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا" (یوحنا ۳ : ۱۶) ہمیں یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیئے کہ مسیح نے خدا کو ہمارے گناہ معاف کرنے پر آمادہ کیا۔ اگر ہم یاد رکھیں کہ مسیح اور باپ کی ایک ہی ذات ہے تو ہم اس غلط فہمی کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا ہمیں معافی بخشنے کے لئے گناہ کا بند توڑ ڈالتا ہے۔

اور جب ہم مسیح کی طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو ہمیشہ یہ کہیں کہ "وہ خُدا ہے"!

پس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسیح میں خدا اپنے کھوئے ہوئے بچّوں کو ڈھونڈ رہا ہے۔ گناہ نے ہم کو خدا سے جدا کر دیا تھا۔ مگر خدا کی محبّت گناہ کی دیوار کے پار اُتر آئی ہے۔ گناہ نے ہم کو خدا تک پہنچنے سے روک دیا تھا۔ مگر خدا کی محبّت ہماری ذلت کی گہرائی تک اُتر آئی تاکہ ہمیں اوپر اُٹھا لے۔ سب سے پہلے خدا انسانی فطرت اختیار کرتا ہے اور نہ صرف انسان کی حیثیت میں ہمارے ساتھ بالکل مل جاتا ہے۔ بلکہ ہماری گری ہوئی حالت میں بھی ہمارا شریک بنتا ہے۔ یہی خداوند کے بپتسمہ کا مطلب ہے۔ (دیکھو متی ۳ : ۱۴، ۱۵)۔ اگرچہ وہ گناہ سے ناواقف تھا وہ ہم گرے ہوئے انسانوں کے ساتھ ایک ہو گیا۔ وہ انسانی گناہ کی ندامت کا کُل بوجھ اپنے اوپر اُٹھا لیتا ہے، اور یوں یوحنّا کے بپتسمہ کا بھی شریک بنتا ہے جو گناہ کی معافی کے لئے تھا۔ اپنی زندگی کے شروع سے آخر تک اُس نے اپنے آپ کو گنہگاروں کے ساتھ ایک جان کر ان کی زندگی میں شریک ہوا۔

اگرچہ اپنی بے انتہا پاکیزگی کے سبب وہ گناہ کی نجاست سے سخت نفرت کرتا تھا۔ تاہم وہ قصداً محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا دوست بنتا ہے۔ اس شرکت کے دُکھ و تکلیف سے الگ ہونے کی آزمائش بار بار اس کے سامنے

آئی۔ لیکن اُس نے ہر مرتبہ الگ ہونے سے انکار کیا کیونکہ تکلیف ہی سے اس کی یہ شرکت کامل ہو سکتی تھی۔ لیکن اس تکلیف کا سب سے دردناک عنصر یہ تھا کہ اس کی محبّت کو رد کر دیا جائے۔ اور جب مسیح صلیب پر چڑھایا گیا تو ایسی ہی اذیّت کا پیالہ اُسے تلچھٹ تک پینا پڑا۔ اور نہ صرف کاہنوں جیسے دشمنوں نے اس پر فتح کے نعرے لگائے اور پلاطس جیسے بے اعتنا لوگ اس کی موت پر رضامند ہو گئے۔ کیونکہ ایسا کرنا زیادہ آسان تھا۔ بلکہ اس کے ولی دوستوں میں سے ایک نے اُس سے بے وفائی کی۔ دوسرے نے اس کا انکار کیا، اور باقی اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گناہ کے باعث جس قدر بھی آفت محبّت پر آ سکتی ہے اُس نے برداشت کی اور آخر وقت تک اُسے برداشت کرتا رہا جس حد تک مسیح اور باپ میں امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس امتیاز میں صرف ہم اس محبّت کی اذیّت کا جس کا اظہار صلیب پر ہوا دوسرا پہلو دیکھتے ہیں۔ اگر اپنی محبت کے رد کئے جانے سے ہمیں دُکھ پہنچتا ہے تو جس شخص سے ہم خود محبت کرتے ہیں اُس کی محبّت کے رد کئے جانے سے کس قدر زیادہ درد پہنچ سکتا ہے۔ جب مسیح کی صلیب کی طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو اس میں خدا کی محبّت کو کامل طور پر ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں "جس نے اپنے حق میں بُرائی کرنے والے گنہگاروں کی اس قدر مخالفت کی برداشت کی" (عبرانیوں ۱۲: ۳) ایسی محبّت جو ان تمام باتوں کو برداشت کرتی ہے جو گناہ اس کے خلاف کرتا ہے، اور آخر وقت تک قائم رہتی ہے گناہ پر فتحیاب ہوتی ہے۔ صلیب تواریخ کے ایک ہی لمحے میں خدا کے دل کی ابدی صلیب کو ظاہر کرتا ہے جو اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ گناہ اس کی محبّت کو رد کرتا رہے گا۔ "لیکن خدا اپنی محبّت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا" (رومیوں ۵: ۸)۔



مسیح مصلوب میں خدا کی محبّت دیکھ کر ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہماری معافی کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا خدا نے کر دکھایا۔ خدا ہمیں اپنی محبّت مُفت دیتا ہے اور اگرچہ ہمارے گناہ بے انتہا ہوں تو بھی وہ ہماری واپسی کا آرزومند ہے۔ خدا کے ساتھ ہمارا اتصال قائم ہونے میں اب جو کچھ رُکاوٹ ہے وہ ہماری ہی طرف سے ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پوری معافی کے لئے دونوں فریقین کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس امر میں مجروح کا یہ حصّہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبّت کا نذرانہ پیش کرے اور مجرم کا یہ کہ وہ عاجز بن کر توبہ بجا لائے۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ہونا تھا وہ پورا ہو چکا ہے، اب صرف ہماری طرف سے کمی باقی ہے جس کے سبب ہم اب تک معافی کی پوری خوشی سے محروم ہیں۔

بہر حال صلیب کا صرف یہی ایک پہلو نہیں ہے جس میں خدا مسیح میں ہو کر اپنی محبّت ظاہر کرتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسیح میں انسان ایک کامل قربانی خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان فطری طور پر اپنے اس فرض کو محسوس کرتا ہے کہ اسے خدا کے حضور قربانی پیش کرنی چاہیئے۔ لیکن خدا کے حضور صرف پاکیزہ زندگی کی قربانی منظورِ نظر ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے گناہ کے سبب مجبور ہیں۔ لیکن مسیح بہ حیثیت انسان اِس کامل قربانی کو پیش کرتا ہے۔ اس نے حقیقی انسانی زندگی اختیار کی، جس میں اُسے حقیقی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تاہم وہ بے گناہ رہا۔ (عبرانیوں ۴: ۱۵)۔ اور وہی آزمائشیں صلیب پر معراج کو جا پہنچیں۔ اگر ہمارا خداوند ذرا بھی تامل کرتا تو وہ صلیب سے بچ سکتا تھا۔ جب ہم اپنی زندگیوں کی آزمائشوں پر غور کرتے ہیں خصوصاً رُوحانی گناہوں کی آزمائشوں پر تو اس قسم کی عنقریب ہر آزمائش کو مسیح پر حملہ آور ہوتے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس نے ان سب کا پورا مقابلہ کیا اور یوں انسان کے گناہ

پر فتح حاصل کی۔ اس کا ایمان خدا پر کبھی کم نہ ہوا اور نہ ہی وہ انسان سے محبت کرنے سے باز رہا۔

اس موقع پر ہم کچھ دیر اس امر پر غور کریں گے جو شائد صلیب پر ان آزمائشوں کا معراج کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ایسا بھید ہے جسے ہم آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا اس کا ذکر کرتے وقت ہمیں تامّل سے کام لینا پڑے گا۔ ہمارا خداوند ہمیشہ اپنے آپ کو گنہگاروں کے ساتھ شریک کرتا تھا، اور ان کے گناہوں کا بوجھ اور شرم بھی اپنے ذمّہ لیتا تھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا صلیب پر اُس نے کچھ دیر کے لئے یہ محسوس کیا کہ اس بوجھ سے خدا کے ساتھ اس کا تعلق منقطع ہو گیا اور گناہ اس کے اور خدا کے درمیان حائل ہو گیا اور خدا نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس خاموشی کے درد کے سبب سے اُس کے منہ سے یہ آواز نکل پڑتی ہے کہ "اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ (مرقس ۱۵ : ۳۴)۔ پھر بھی اس تاریک گھڑی میں اس کا ایمان مضبوط رہتا ہے اور اُس کی محبّت قائم رہتی ہے۔ اور کچھ دیر بعد کامل ایمان کے ساتھ کہتا ہے "اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھ میں سونپتا ہوں"۔ (لوقا ۲۳ : ۴۶) اُس نے فتح حاصل کر لی اور اس کا کام ختم ہو گیا۔ اُس کا یہ قول کہ "پورا ہوا" (یوحنا ۱۹ : ۳۰) بجا ثابت ہوتا ہے۔

اس موقع پر ہم ایک اور نکتہ پر غور کر سکتے ہیں، حالانکہ اس کی تشریح کرنا آسان نہیں ہے۔ معافی کا حاصل کرنا کم از کم جزوی طور پر توبہ پر مبنی ہے لیکن گناہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیں گناہ کی اصلیت سے بے باک کر دیتا ہے۔ کسی گنہگار کو گناہ اس قدر ہولناک معلوم نہیں ہوتا جس قدر ایک خدا رسیدہ یا نیک انسان کو معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ ہم خود گنہگار ہیں اس کامل توبہ کا احساس



جیسا کہ ہونا چاہیئے ہم میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن جب مسیح نے ہمارا گناہ اور ہمارا جرم اپنے اوپر لے لیا تو اُس نے گناہ کی پوری بُرائی کو محسوس کیا۔ اسی لئے بحیثیت انسان وہ خدا کے حضور گناہ کے لئے انسان کی حقیقی توبہ نذر گذران سکتا تھا۔

جس طرح صلیب خدا کی محبّت کو پورے طور پر ظاہر کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ خدا کی محبّت کو کسی چیز سے شکست نہیں ہو سکتی اسی طرح صلیب گناہ کی بُرائی کو بھی پوری طور پر ظاہر کرتی ہے۔ کسی اور جگہ ہم گناہ کی بُرائی کو اس قدر صفائی سے نہیں دیکھ سکتے۔ جب گناہ کو کامل نیکی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس پر صرف یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ نیکی کو برباد کرنے کی کوشش کرے۔ اسی لئے گناہ سب سے بڑی لعنت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جن گناہوں نے مسیح کو صلیب پر چڑھایا تھا وہ عام انسانوں کے گناہ تھے۔ اس لئے صلیب میں ہم اپنے ذاتی گناہوں کی حقیقی اصلیت کو دیکھ سکتے ہیں اور اس صورت سے صلیب گناہ کی سزا کہی جا سکتی ہے۔ لیکن صلیب گناہ پر فتح یابی کا بھی یقینی نشان ہے۔ کیونکہ صلیب میں محبّت فتح مند ہوتی ہے۔

صلیب میں گناہ اور محبّت کی سب سے زبردست جنگ واقع ہو چکی ہے جس میں گناہ کو مکمل شکست ہوئی ہے۔ مسیح کا جی اُٹھنا محض ایک تواریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک روحانی اور اخلاقی لزوم ہے۔ چونکہ محبّت آخر تک قائم رہتی ہے۔ بلکہ موت بھی گوارا کرتی ہے اس لئے اسے سب سے بلند اور کامل مرتبہ بخشا جاتا ہے۔ مسیح کی صلیب کو اور مسیح کے جی اُٹھنے کو جُداگانہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ دونوں ایک ہیں۔ مسیح میں خدا کی محبّت کا ظاہر ہونا، خدا کا انسان بننا، صلیب اٹھانا اور جی اُٹھنا یہ سب باتیں خدا کے ساتھ ہمارا اتحاد قائم کرنے کے وسیلے ہیں۔

مسیح میں ہم زندگی کی، خلاقی فطرت کو فتحیاب ہوتے دیکھتے ہیں ۔ اس لئے مسیح میں خدا کے ساتھ اور زندگی کے ساتھ ہمارا پورا میل ملاپ ہو جاتا ہے۔ مسیح میں جو الہٰی مغفرت نظر آتی ہے اُس پر ہم جس قدر غور کرتے ہیں اسی قدر اس کی تشریح کرنے میں ہماری کوشش قاصر رہے ۔

اس مسئلہ پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اگرچہ ہم ان سب سے اپنی روحانی زندگی کے لئے کافی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں، تاہم آخر میں ہم معلوم کرتے ہیں کہ خدا کے فضل کا اندازہ لگانا یا اس کا مطلب سمجھنا بعید الامکان ہے ۔لیکن جب ہم صلیب کے نزدیک آتے ہیں تو ہم اپنے تجربے سے معلوم کرتے ہیں کہ مسیح میں خدا معافی بہم پہنچا رہا ہے ۔وہاں خدا کے ساتھ ہماری صلح ہو جاتی ہے اور ہمیں ایسی طاقت بخشی جاتی ہے جس سے ہم ابدی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

بیاں کس طرح کریں ہم  اُس رنج و الم کا
پر سبب خوب ہم جانتے ہیں  گنہ ہمارا تھا

وہ مُوا تھا کہ ہر انسان  نجات کا وارث ہو
پھر جی اُٹھا کہ باپ کے پاس  پہنچائے بندوں کو

# بابِ ہفتم

## راستباز ٹھہرنا (JUSTIFICATION)

صلیب پر جب میں کرتا دھیان  جس پر ہے مُوا ربّ النّور
تو نفع گنتا ہوں نقصان  حقیر میں جانتا سب غرور

گر نذر کروں کُل جہان  تو تیرے لائق نہیں ہے
تُو چاہتا میرا دل و جان  ہو سدا تیرے پیار کی جے

پچھلے باب میں ہم خدا کے اُس کام پر غور کر رہے تھے جو اُس نے ہمیں اپنے پاس بُلانے اور اپنے ساتھ ہماری صلح کرانے کے لئے مسیح میں پورا کیا ۔اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہم اس معافی کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں یعنی خدا کے اس کام سے کیونکر فیضیاب ہو سکتے ہیں ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ معافی کے دو فریقین ہوتے ہیں ۔ ایک تو وہ شخص جس نے بدی کی ہو اور دوسرا وہ جس سے بدی کی جائے ۔ مکمّل معافی کے لئے ان دونوں کو اپنے اپنے فرائض ادا کرنا لازمی ہیں ۔ سب سے پہلا مسیحی جس نے اس مسئلہ پر غور کر کے تشریح پیش کی وہ مقدس پولس تھا جس کے بیان کو مسیحی تجربے نے صحیح پایا ۔ لہٰذا

اس سلسلے میں ہمیں اُس کے خیالات کو اور جو الفاظ وہ اپنے بیان میں استعمال کرتا ہے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

شروع میں مقدس پولس ایک یہودی کی حیثیت میں خدا کی خدمت کرنے کی کوشش کرتا تھا اور ہمیں خود بتاتا ہے کہ اُس نے شریعت کی صحیح اور با احتیاط پابندی سے خدا کے ساتھ صلح قائم کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ کسی صورت سے خدا کے فضل کو حاصل کرلے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ "وہ شریعت کے اعتبار سے بے عیب تھا" (فلپ ۳: ۶)۔ ظاہرا طور پر اس کی جستجو میں ہر چیز فیض رساں معلوم ہوتی تھی۔ وہ برگزیدہ قوم سے تھا اور فریسی بھی تھا جو یہودی قوم کا سب سے زیادہ مذہبی فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے گملی ایل سے تعلیم حاصل کی تھی جو اس زمانے کے سب سے اعلیٰ معلّموں میں سے تھا، اور اس کے تمام کام شریعت کی روشنی کے مطابق اس کی سمجھ میں درست تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُسے اطمینان حاصل نہ ہوا۔ پھر یکایک دمشق کی راہ پر اُس نے یہ معلوم کیا کہ وہ سکونِ قلب جس کا وہ آرزومند تھا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی کام کے صلہ میں جو وہ کر سکتا تھا، بلکہ محض اس کام کے وسیلے سے جسے مسیح پورا کر چکا ہے۔ اس نے معلوم کیا کہ جو کام ہونا تھا اُسے خدا خود پورا کر چکا ہے۔ اب صرف خدا کی بخشش کو قبول کرنا ہی باقی ہے۔ اُس وقت سے اُس نے اپنی ساری زندگی اس خوش خبری کے پھیلانے میں جو اُس نے حاصل کی تھی وقف کر دی، اور اس کی زندگی کا ایک زبردست مسئلہ جو ختنہ سے متعلق تھا اس خوش خبری کے ایک خاص پہلو سے وابستہ ہو گیا۔

اس خوش خبری کے بیان میں مقدس پولوس "راستباز ٹھہرائے جانے" کے فقرے سے کام لیتا ہے۔ اس فقرے کو وہ اسی معنی میں استعمال کرتا ہے،



جس معنی میں اہلِ یہود بھی اُسے استعمال کرتے تھے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہودیوں کے لئے یہ فقرہ کیا مطلب رکھتا تھا۔ اہلِ یہود کسی کام کے طریقۂ عمل کے بجائے اس کے نتیجے کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے لئے "راستباز ٹھہرائے جانے" کا مطلب راستباز بننا نہیں بلکہ راستباز ٹھہرانا ہے۔ یعنی کسی شخص کو راستباز قرار دینا۔ چنانچہ خروج ۲۳: ۷ میں خدا کہتا ہے کہ "میں شریر کو راست نہیں ٹھہراؤں گا" اور یسعیاہ نبی اپنی کتاب کے ۵ باب، ۲۳ آیت میں اُن لوگوں کو ملامت کرتا ہے "جو رشوت لے کر شریروں کو صادق ٹھہراتے ہیں"۔ کسی بُرے آدمی کو اچھا بنا دینا بھلا کام کہا جا سکتا ہے۔ لیکن نبی اس جگہ عدالت کے غلط فتوے پر ملامت کر رہا ہے جب کہ رشوت کی نیت سے شریروں کو راست ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہ سوال جو ہمیشہ یہودیوں کے سامنے رہتا تھا وہ یہ تھا خدا کے حضور انسان کس طرح راست ٹھہرایا جا سکتا ہے اور کیونکر خدا کے ساتھ اس کا میل ہو سکتا ہے (زبور ۱۴۳: ۲) "اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا۔ کیونکہ تیری نظر میں کوئی آدمی راستباز نہیں ٹھہر سکتا"۔ اس کا جواب یہودیوں کا یہ تھا کہ شریعت کی تعمیل سے انسان خدا کی نظر میں راستباز ٹھہر سکتا ہے۔

چنانچہ مقدس پولس شریعت کے ذریعے سے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر ناکامیاب رہا۔ اُس کا ضمیر یہ گواہی دیتا تھا کہ وہ اپنے کاموں کے ذریعے سے نہ تو راستباز ٹھہر سکتا ہے اور نہ رہائی حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کی نظر میں انسانی فضیلت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ دمشق کی سڑک پر جب مسیح اُس پر ظاہر ہوا تو اُس نے معلوم کیا کہ وہ غلط طریقے پر کوشش کر رہا ہے۔ ہم اپنے نیک کاموں سے راستباز نہیں ٹھہر سکتے بلکہ خدا کے فضل سے جو مسیح کی قربانی کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے راستباز ٹھہر سکتے ہیں۔

اس موقع پر ہمیں فضل کے تصوّر میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ فضل کے

معنی ہیں مہربانی اور اعانت، اثر اور قوت جو خدا ہمیں عطا فرماتا ہے۔ اس لئے فضل ایک روحانی اور شخصی چیز ہے جو صرف روحانی اور شخصی وسیلوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ فضل حاصل کرنے کے لئے کوئی عملی (Mechanical) صورت نہیں ہو سکتی۔ ہم الٰہی فضل کو انہیں روحانی اور شخصی طریقوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی ایسے انسان سے جو ہم سے زیادہ بزرگ، نیک اور دانشمند ہو اس کی رضا و اعانت، اثر و طاقت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

یہ الٰہی فضل جس سے ہم اطمینان حاصل کرتے اور خدا کی حضوری اور رفاقت میں داخل کئے جاتے ہیں، نہ تو کبھی کمایا گیا ہے نہ کبھی کمایا جا سکتا ہے۔ ہم اسے صرف بطور بخشش قبول کر سکتے ہیں اور ایمان کے ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لفظِ "ایمان" کے مطلب کو بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ مختلف معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (۱) عہد نامۂ عتیق میں یہ لفظ وفاداری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حبقوق ۲: ۴ میں یوں آیا ہے "لیکن صادق اپنے ایمان سے زندہ رہے گا" مقدس پولس اس عبارت کو بہت پسند کرتا ہے۔ (۲) مقدس پولس کی تعلیم میں ایمان اس اعتماد کو کہتے ہیں جو ایک شخص دوسرے شخص پر رکھتا ہے، جیسے کہ ایک بچہ اپنے والدین پر اور ایک انسان خدا پر اعتماد رکھتا ہے۔ ہم خیال رکھیں کہ اس معنی میں اگر کسی شخص پر ایمان رکھا جاتا ہے تو اس شخص کے ہم خیال ہونا اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم دشمن کی فوج کے سپہ سالار پر بھروسہ نہیں رکھ سکتے۔ یہی خیال ہمارے عقیدوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ "میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں" نہ یہ کہ "میں خدا کے وجود کا یقین کرتا ہوں"۔ (۳) عبرانیوں کے خط میں ایمان کا ایک اور مطلب پایا جاتا ہے: "ایمان اُمید کی ہوئی چیزوں کا اعتماد اور اَن دیکھی چیزوں کا ثبوت ہے۔" (عبرانیوں ۱۱: ۱)



اس سے وہ طاقت مراد ہے جس سے ہم روحانی سچائیوں کو دیکھ سکتے اور یہ بھروسہ کر سکتے ہیں کہ سچائی ضرور بُرائی پر غالب آ سکتی ہے۔ اور اس پر بھی کہ وہ باتیں جن کا پورا ہونا ظاہراً ناممکن معلوم ہوتا ہے پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ ہی ہم ولبر فورس (Wilberforce) اور دیگر جماعتی مصلحین کے ایمان کی نسبت کہہ سکتے ہیں جن کو یقین تھا کہ غلامی اور اس قسم کی اور برائیوں کا دور کرنا غیر ممکن نہیں ہے۔ (۴) شبانی خطوط اور خطوط عام میں مسیحی تعلیم کے مجموعے کو ایمان کہا گیا ہے۔ "ایمان جو مقدسوں کو ایک ہی بار سونپا گیا تھا"۔ (یہوداہ: ۳)۔ "میں نے ایمان کو محفوظ رکھا"۔ (۲ تمتھیس ۴: ۷)۔ (۵) آخر میں مقدس یعقوب کے خط میں لفظ ایمان تعقلی رضامندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "تو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے خیر۔ اچھا کرتا ہے۔ شیاطین بھی ایمان رکھتے اور تھرتھراتے ہیں"۔ (یعقوب ۲: ۱۹)۔ یہ تمام تصورات ہمارے اس نظریے میں پائے جاتے ہیں کہ گنہگار ایمان کے وسیلے سے راستباز ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن ان تصورات میں شخصی اعتقاد حاصل کرنا اور روحانی سچائیوں کی پہچان رکھنا سب زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ ہم صرف ایسی حالت میں کسی شخص کی رضا و رغبت اور روحانی اثر سے مستفید ہو سکتے ہیں جب کہ ہم اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی طرح خدا کے فضل کو بھی ہم صرف اُس حالت میں حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ہم اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

اس بیان میں ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ ایمان ایک خاص قسم کی فضیلت ہے جس کا صلہ ہم خدا سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ ایمان ایک ذریعہ ہے جس سے خدا کی بخشش حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہمارا دوست ہمیں کوئی مادی بخشش بھیجتا ہے تو اس بخشش کو قبول کرنا ہمارا فرض ہے لیکن وہ بخشش

ہمارے قبول کرنے کا صلہ نہیں کہی جاسکتی۔ اسی طرح اگر ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں
تو ہم اُس کے فضل کو بطور بخشش حاصل کرتے ہیں۔

خدا کے فضل کی یہ خوشخبری اس قدر عمدہ ہے کہ اُس کا یقین کرنا دشوار
معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ خیال کہ انسان کو اپنی نجات کما کر حاصل کرنی چاہیئے، بار بار
لوگوں کے ذہن میں آتا ہے۔ لیکن انجیل کا خاص پیغام یہ ہے کہ انسان کو خدا
کے حضور منظور نظر ٹھہرانا خدا ہی کا کام ہے اور اسی کی عین بخشش ہے۔ پس جو شخص
اس کا یقین کرکے خدا کی بخشش کو قبول کرتا ہے چاہے وہ کیسا ہی گنہگار ہو راستباز
ٹھہر سکتا ہے۔

بہرکیف اس نظریئے کے خلاف اکثر یہ سوال کرتے ہیں:۔ کیا یہ خیال منافی
اخلاق نہیں کہ گناہ سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا؟۔ یہ اعتراض بار بار پیش کیا
جاچکا ہے۔ بلکہ مقدس پولس پر تو یہ الزام لگایا گیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ "ہم
گناہ کرتے رہیں تاکہ فضل زیادہ ہو" (رومیوں ۶: ۱، ۱۵)۔ اور یہودیوں
کے دینی رہبروں نے ہمارے خداوند کی نسبت یہ شکایت کی کہ وہ "گنہگاروں سے
ملتا ہے" (لوقا ۱۵: ۲)۔ پہلی نظر میں تو یہ اعتراض کافی اہم معلوم ہوتا ہے،
لیکن حقیقت میں یہ واجب اعتراض نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ معترض گناہ کو ایسی
جگہ دیکھنا چاہتا ہے جہاں گناہ موجود نہیں۔

جو شخص صلیب کی طرف نظر اُٹھاتا ہے وہاں وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ گناہ خدا
کے لئے کیا مطلب رکھتا ہے اور وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ گناہ کی کچھ اہمیت نہیں۔
مسیح مصلوب کی اذیت کو دیکھ کر ہم احساس کرسکتے ہیں کہ انسان کے گناہوں
کی معافی کے لئے خدا کو کیسی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ کیونکہ ہم الہٰی مغفرت کو
کما نہیں سکتے۔ اس لئے ہمیں اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ گناہوں کی معافی



کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس سے کچھ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے مثلاً
کوئی آدمی اپنی بیوی کی محبت کو کما نہیں سکتا۔ کیونکہ محبت ایک ایسی نعمت ہے جو
بغیر قیمت کے بطور بخشش حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن جب ایک شخص اپنی محبوبہ کی محبت
حاصل کرلیتا ہے تب وہ معلوم کرتا ہے کہ محبت کیسی عمدہ چیز ہے کہ جس سے اس کی
زندگی بالکل نئی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ الہٰی فضل ایمان کے ذریعے سے حاصل ہوتا
ہے۔ جو محض دماغی اعتقاد سے نہیں بلکہ خدا پر شخصی اعتماد رکھنے سے حاصل ہوتا
ہے۔ اس لئے ایمان ایک اخلاقی صنعت ہے۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ ہم خدا
کی طرف ہوجائیں اور اُسے اپنی زندگی تبدیل کرنے کا موقع دیں۔ جیسا کہ ہم
کہہ چکے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایمان کسی صورت سے خدا کے فضل کو حاصل
کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ ایمان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ ہمیں الہٰی فضل
حاصل کرنے کے لائق بناتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مسیح کی زندگی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ ہمارے
ساتھ بالکل ایک ہوجائے۔ بقول مقدس پولس، مسیح ہم میں رہتا ہے اور ہم اُس
میں۔ اس لئے ہماری زندگی اس کی زندگی سے بالکل تبدیل ہوجاتی ہے اور
ہماری زندگی اس کی زندگی کے ساتھ ایک ہوجاتی ہے، اور یوں مسیح ہمارے
گناہوں کو مغلوب کرتا ہے۔ مقدس پولس کا یہی مطلب ہے، جب وہ کہتا ہے
کہ "(میں) اُس میں پایا جاؤں۔ نہ اپنی اس راستبازی کے ساتھ جو شریعت
کی طرف سے ہے بلکہ اس راستبازی کے ساتھ جو مسیح پر ایمان لانے کے سبب
سے ہے اور خدا کی طرف سے ایمان پر ملتی ہے" (فلپیوں ۳: ۹)
اس موقع پر ہمیں ایک اور سوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے جسے ہم پہلے

بھی دیکھ چکے ہیں۔ اگر ہم گناہوں کی معافی اپنی کوششوں سے حاصل نہیں کرتے بلکہ خدا سے بطور بخشش حاصل کرتے ہیں اور ہمارا خداوند بھی کہتا ہے کہ "کوئی میرے پاس نہیں آسکتا جب تک کہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اُسے کھینچ نہ لائے" (یوحنا ۶ : ۴۴)۔ تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کسی پر تو فضل کرتا ہے اور کسی کو اس سے محروم رکھتا ہے؟ ہم سب جو اس کی معافی کا تجربہ رکھتے ہیں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہم جو کچھ ہیں اُسی کے فضل سے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جو مسیحی نہ ہونے پر بھی ہم سے زیادہ دانش مند اور نیک خصلت معلوم ہوتے ہیں۔ تو کیا ہم ان کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں وہ ملعون اور ابدی ہلاکت کے لائق ہیں؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مسئلے کے کئی پہلو ہیں جن میں سے ایک بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ کتابِ مقدس میں ایسے فقرے پائے جاتے ہیں جو اگر اپنی سیاق عبارت سے جدا کر دیئے جائیں تو ان سے اس قسم کا مطلب لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں دوسرے مقولات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے جن میں سے چند یہ ہیں: "جو کوئی میرے پاس آئے گا اُسے میں ہرگز نکال نہ دوں گا" (یوحنا ۶ : ۳۷)۔ "تمہارا آسمانی باپ یہ نہیں چاہتا کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو" (متی ۱۸ : ۱۴)۔ "وہ چاہتا ہے کہ سب آدمی نجات پائیں اور سچائی کی پہچان تک پہنچیں" (۱۔تیمتھیس ۲ : ۴)۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ خدا کا فضل ہماری خود مختاری کو باطل نہیں کرتا اس لئے ہم اس کے فضل اور ارادہ میں رخنہ اندازی کر سکتے ہیں (دیکھو اعمال ۷ : ۵۱، افسس ۵ : ۱۹)۔ اگرچہ ہماری نجات الہٰی فضل پر موقوف ہے، تاہم ہمیں خدا کے ساتھ تعاون کرنا اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے مطابق بنانا ضروری ہے۔ عہد نامۂ جدید میں جن موقعوں پر "مقرر" اور برگزیدہ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اُن کا مطلب شائد لفظ "انتخاب" سے زیادہ اچھی



طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا بعض لوگوں اور قوموں کو خاص برکتوں اور ذمہ داریوں کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ لیکن اُنھیں خود "اپنے بلاوے اور برگزیدگی کو ثابت کرنا پڑتا ہے" (۲۔پطرس ۱ : ۱۰)۔ اس امر میں سب سے زیادہ مشہور و معروف مثال یہوداہ ہے۔ مسیح نے اُسے رسول ہونے کے لئے منتخب کیا، لیکن وہ خود خدا کی بلاہٹ سے منحرف ہو گیا۔ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ دوسروں کے لئے خدا کیا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن ہم اپنے لئے خدا کے بلاوے اور فضل کو پہچان سکتے ہیں جس سے ہم بڑی ہمت اور تقویت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "جس نے ہم میں نیک کام شروع کیا ہے وہ اُسے یسوع مسیح کے دن تک پورا کر دے گا" (فلپیوں ۱ : ۶)۔

# باب ہشتم

## تقدیس
## (Sanctification)

مبارک ہیں پاک دل — خدا کو دیکھیں گے
وہی خدا کے ہیں رازدار — اور مسکن یسوع کے

حیات اور اطمینان — خداوند لایا ہے
سبق اُس نے حلیمی کا — ہمیں سکھایا ہے

فروتن دل میں وہ — خود آکر بستا ہے
پاک دل میں اپنا شاہی تخت — وہ قائم کرتا ہے

ربّ تیرے پاک حضور — یہ آرزو میری ہے
دے مجھے دل غریب اور پاک — جو ہیکل تیری ہے

راستباز ٹھہرایا جانا مسیحی زندگی کا آغاز ہے اختتام نہیں۔ جوں ہی ہم خدا کی طرف پھرتے ہیں، ہم معاف کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن راستباز بنایا جانا ایک





مزید عمل ہے جسے مقدس بنایا جانا بھی کہتے ہیں۔ عملی طور پر راستباز ٹھہرنا اور مقدس بننا آپس میں نہایت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص نیک بنے بغیر معافی کے حقیقی تجربہ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ نظری طور پر تقدیس پہلے ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ بلکہ جوں ہی خدا کا فضل دل میں داخل ہوتا ہے انسان پاک بننے لگتا ہے۔ بہرکیف مقدس بننا ایک ایسا عمل ہے جو زندگی کے آخر تک جاری رہتا ہے۔

عہدنامۂ جدید میں اکثر مکمل تقدیس کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً یوحنا کہتا ہے "جو کوئی خدا سے پیدا ہوتا ہے وہ گناہ نہیں کرتا ہے"۔ (۱۔یوحنا ۳ : ۹) اور یہ اس لئے کہ ہم مسیح کی روح حاصل کرتے ہیں، جس سے ہماری پوری زندگی بدل جاتی ہے اور گناہ پر ہمیں پوری فتح حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہم تقدیس کے مسئلہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مکمل تقدیس پر غور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اگر ہم مسیحی خاندان کا بیان پیش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں افتتاحاً کامل نکاح کا فرض کر لینا ضروری ہے۔ حالانکہ نکاح کا عقد شروع میں چاہے کتنا ہی صحیح اور بے عیب کیوں نہ ہو صرف بعد کے تجربے سے اُسے کامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض باتوں کے لحاظ سے شروع ہی میں مکمل تقدیس کو فرضاً تسلیم کر لینا چاہیئے، حالانکہ اس زندگی میں وہ کبھی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی بلکہ آخر تک اس میں روز بروز زیادہ ترقی ہونی چاہیئے۔ عہدنامۂ جدید میں جداگانہ آیات کے بجائے جب ہم کل عبارت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ "ہم اب تک نہ پا چکے ہیں اور نہ کامل ہو چکے ہیں"۔ (فلپیوں ۳ : ۱۲)

جیسا کہ راستباز ٹھہرائے جانے کے مضمون میں ہم دیکھ چکے ہیں، ہماری زندگیوں میں تبدیل کرنے والی قوّت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ مسیح ہم میں سکونت کرتا ہے، وہ روح القدس کے وسیلے سے ہمارے پاس آتا ہے اور اپنے اثر سے ہمارے باطن کو بدل دیتا ہے۔ یہی بات ہم ان تمام تعلقات میں دیکھتے ہیں جو ہم دوسروں کے

ساتھ رکھتے ہیں۔ جب ہم اوروں کے ساتھ صحبت اختیار کرتے ہیں خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جن سے ہم محبت کرتے اور عزّت کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہماری زندگی میں نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ہم ان کے الفاظ، اعمال اور صفات کی نقل کرنے لگتے ہیں، اور اکثر بلا جانے ہوئے ان کے خیالات بھی ہمارے حالات بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب مسیح ہمارے اندر سکونت کرتا ہے تو ہم اس کی نقل کرتے اور اس کی سی زندگی اختیار کر لیتے ہیں: "ابھی تک یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ہم کیا کچھ ہوں گے۔ اتنا جانتے ہیں کہ جب وہ ظاہر ہوگا تو ہم بھی اُس کی مانند ہوں گے"۔ (۱-یوحنا ۳: ۲) مسیح میں ہماری یہ اعلیٰ اُمید ہے۔

اب ہم اس عجیب تبدیلی پر غور کریں گے جو مسیح ہماری زندگی میں پیدا کر سکتا ہے۔ جب ہم زندگی کی دشواریوں، تفاوتوں، تکلیفوں اور بے انصافیوں سے دوچار ہوتے ہیں اور زندگی کے بھید اور پیچیدگیوں کو دیکھتے ہیں تو ہم اکثر زندگی اور خدا سے انحراف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی کی ایک ناپوس کن کشمکش میں مبتلا ہو کر اپنی روحوں کو برباد کر لیتے ہیں، اور یوں سخت دل اور تلخ مزاج بن جاتے ہیں۔ یا بعض اوقات ہم یہ سوچتے ہیں کہ ایسی حالت میں محض تسلیم و رضا اختیار کرنا بہتر ہے جس سے ہم کمزور اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم اپنی زندگی کو مسیح میں دیکھتے ہیں تو زندگی سے ہماری صلح ہو جاتی ہے اور خدا سے میل ملاپ ہو جاتا ہے اور ہمیں "خدا کا اطمینان جو سمجھ سے بالکل باہر ہے" (فلپیوں ۴: ۷) حاصل ہو جاتا ہے، یہ جانتے ہوئے "کہ سب چیزیں مل کر خدا سے محبت کرنے والوں کے لئے بھلائی پیدا کرتی ہیں"۔ (رومیوں ۸: ۲۸) ہم اس طاقت سے جس سے مسیح نے برائی کو مغلوب کیا، اپنی زندگی کی برائیوں سے جنگ کر سکتے ہیں، اور مسیح کے صبر و تحمل سے اپنی زندگی کی تکلیفوں کو گوارا کر سکتے ہیں، کیونکہ



بقول مقدس پولس "ہر ایک بات اور سب حالتوں میں ہم نے سیر ہونا، بھوکا رہنا اور بڑھنا گھٹنا سیکھا ہے۔ جو مجھے طاقت بخشتا ہے، اُس میں میں سب کچھ کر سکتا ہوں"۔ (رومیوں ۴: ۱۲، ۱۳)

جب ہم راستباز ٹھہرائے جانے کے مضمون پر غور کر رہے تھے تو ہم نے یہ دیکھا تھا کہ اِس کو عمل میں لانے کے کام میں ہمارے افعال کوئی حصّہ نہیں رکھتے۔ مگر تقدیس کے عمل میں ہمارے نیک کام الہیٰ فضل کی بدولت ضرور حصّہ رکھتے ہیں۔ مقدّس پولس کہتا ہے کہ "ڈرتے اور کانپتے ہوئے اپنی نجات کا کام کئے جاؤ۔ کیونکہ جو تم میں نیّت اور عمل دونوں کو اپنے نیک ارادہ کو انجام دینے کے لئے پیدا کرتا ہے وہ خدا ہے"۔ (فلپیوں ۲: ۱۲، ۱۳) اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہم پر صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ہماری دعائیں، ہمارے مراقبات، ہماری شخصی اور جماعتی عبادت، ہمارا مختلف الہٰی کاموں میں حصّہ لینا ان سب کاموں کے ذریعے سے ہم پاکیزگی میں ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کاموں میں غفلت کرتے ہیں تو ہماری روحانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرکیف ان کاموں کے سبب سے ہم الہیٰ فضیلت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارے خداوند کا یہ قول ہے کہ "جب تم ان باتوں کی جن کا تمھیں حکم ہوا تعمیل کر چکو تو کہو کہ ہم نکمّے نوکر ہیں۔ جو ہم پر کرنا فرض تھا وہی کیا ہے"۔ (لوقا ۱۷: ۱۰)۔ علاوہ ازیں صرف خدا کے فضل سے یا اس کی مدد اور طاقت سے ہم ایسے کام کرنے کی طبیعت حاصل کر سکتے ہیں اور جب ہم میں ایسی طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو خدا ہی کی مدد سے ان کاموں کو پورا کر سکتے ہیں۔

ہمارے کام نہ صرف ہمارے بچائے جانے میں حصّہ رکھتے بلکہ دوسروں

کی نجات میں بھی مدد پہنچاتے ہیں۔ انسانی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنی نجات ایک حد تک دوسروں کے نیک کاموں کی بدولت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں ان کی نیک زندگی، اُن کی تعلیم اور اکثر اُن کے دُکھ و تکلیف ان سب سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس بات کو پُورے طور پر نہیں سمجھ سکتے کہ خدا کس طرح ایسے نیک کاموں کو استعمال کرتا ہے تاہم ہر طرف یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان مقدسین کے ذریعے سے جو ایمان میں قائم رہتے ہیں، دوسرے لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی لئے مقدس پولُس کرنتھیس کے لوگوں کو یہ نصیحت کرتا ہے: "پس اے میرے عزیز بھائیو ثابت قدم اور قائم رہو، اور خداوند کے کام میں ہمیشہ افزائش کرتے رہو، کیونکہ یہ جانتے ہو کہ تمہاری محنت خداوند میں بے فائدہ نہیں ہے" (اکرنتھ ۱۵: ۵۸)

# باب نہم

## مسیح کا زندہ ہونا اور صعود کرنا

اے مسیح! تو جلال کا بادشاہ
تو باپ کا ازلی بیٹا ہے
جب تو نجات کے لئے انسان بننے کو تھا
تو نے کنواری کے پیٹ سے نفرت نہ کی
جب تو موت کی تلخی پر غالب ہوا
تو نے آسمان کی بادشاہت سارے مومنین کے لئے کھول دی
تو خدا کے دہنے باپ کے جلال میں بیٹھا ہے
ہمیں یقین ہے کہ تو ہماری عدالت کے لئے آئے گا
اس لئے ہم تیری منت کرتے ہیں کہ تو اپنے بندوں کی مدد کر
جن کا فدیہ تو نے اپنے قیمتی خون سے دیا ہے
انھیں ابدی جلال میں اپنے مقدسوں کے ساتھ شمار کر - (حمد اللہ)

مسیح کا کام، خدا کے مجسم بیٹے کی حیثیت میں عید قیامت کے پہلے دن یا اس کے صعود کے دن ختم نہیں ہو گیا، بلکہ وہ اب بھی مجسم ہے اور اب تک کامل خدا

اور کامل انسان ہے۔ حالانکہ دنیوی زندگی کی بندشوں سے وہ آزاد ہے۔ قیامت اور صعود باپ کے پاس مسیح کی مراجعت کے دو اہم حصّے ہیں۔ جن کو عقیدے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مسیح کا زندہ ہونا اور صعود کرنا اس کے حق بجانب ہونے اور انسان کی سزا کی تنسیخ اور ہمارے ایمان کی تصدیق کے الٰہی ثبوت ہیں۔ ہمارا یہ ایمان کہ خدا مسیح میں ظاہر ہوا مسیح کے زندہ ہوئے بغیر تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل رسولوں کی زندگیاں مسیح کے زندہ ہونے ہی سے تبدیل ہوئی تھیں اور روحانی نقطۂ نظر سے جب ہم محبّت کو ظاہرہ شکست میں مضبوط اور ممتاز ہوتے دیکھتے ہیں تب ہی ہم اس محبّت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

زندہ ہونے کے بعد مسیح کچھ عرصے کے لئے دنیا میں چند خاص کاموں کے لئے ٹھہرا رہا۔ وہ کام یہ تھے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلائے اور اپنی آخری تعلیم اُن کے سپرد کرے۔ لیکن ان ایام میں وہ ان کے ساتھ اس طرح نہیں رہتا تھا جس طرح ایّام گلیلی میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ کیونکہ اب اُن کو رُوح القدس کے ذریعے سے اپنی زندگی میں مسیح کی زیادہ گہری رفاقت کا احساس حاصل کرنا تھا۔ اس سبب سے زندہ مسیح کے دیدار چالیس دن بعد ختم ہوگئے (صرف ایک مرتبہ اور مقدّس پولُس کو دمشق کے راستے پر نظر آتا ہے)۔ اور صعود کے وقت باپ کے پاس اس کی مراجعت پوری ہوگئی۔

زندہ ہونے کے بعد مسیح کی زندگی روحانی عالم کی ہوگئی۔ اس لئے ہمارے پاس اس کے صحیح بیان کے لئے موزوں الفاظ نہیں اور ہمیں تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے جن سے اگرچہ پوری حقیقت کا پتہ نہیں چلتا تو بھی کم از کم



حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ایسے فقرے استعمال کرنے پڑتے ہیں مثلاً "وہ واپس چلا گیا"، "صعود کر گیا"، "خدا کے داہنے ہاتھ جا بیٹھا"۔ ایسے فقروں کو ہم اُن کی موزونیت کے سبب نہیں بلکہ اُن کے محض ناکافی ہی ہونے کی وجہ سے استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ مسیح کے جسمانی صعود کا ماننا بجا ہے، تاہم صعود کو ایک ایسا منظر سمجھنا جس سے ہم پر ایک روحانی حقیقت ظاہر کی جاتی ہے زیادہ اہم بات ہے۔ ایک نقطۂ خیال سے بہت لحم میں لوگوں خدا سے صادر ہوتا ہے، تاکہ انسانی زندگی اختیار کر کے ہمارے ساتھ ایک ہو جائے اور صعود میں وہ ہمارے ساتھ شرکت رکھتے ہوئے اور مع انسانی فطرت کے خدا کے پاس واپس چلا جاتا ہے اور اس واپسی میں ہم کو بھی خدا کے پاس لے آتا ہے۔ صعود کا یہ مطلب عبرانیوں ۷: ۲۴، ۲۵ میں نہایت خوبی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ "مگر چونکہ یہ ابد تک قائم رہنے والا ہے اس لئے اس کی کہانت لازوال ہے۔ اسی لئے جو اس کے وسیلے سے خدا کے پاس آتے ہیں وہ اُنھیں پوری پوری نجات دے سکتا ہے کیونکہ وہ اُن کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے۔" لفظ "شفاعت" اس جگہ شفاعتی دعا سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ یہاں اس لفظ کے معنی ہیں کسی دوسرے کے لئے ہر قسم کی عملی مدد بہم پہنچانا، باپ کے پاس مراجعت کرنے سے وہ ہمیں خدا کی خاص حضوری میں پہنچا دیتا ہے، جس سے ہم بھی اس کے جی اُٹھنے اور صعود میں شریک ہوتے ہیں۔

صعود کے بعد سے مسیح کا ایک کام یہ ہے کہ وہ دنیا کا انصاف کرے۔ یہ کام وہ نہ صرف خدا کی حیثیت میں کرتا ہے جیسا کہ عہد نامۂ عتیق میں اس کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ بلکہ انسان کی حیثیت میں بھی انصاف کرتا ہے۔ اس کا انصاف انسان کے لئے ایسا انصاف ہے جو اس کے انسان ہونے ہی سے صادر

ہوتا ہے۔ وہ محض الٰہی انصاف نہیں ہے جو بیرونی ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس عدالت کو "آخری فیصلہ" کہتے ہیں جو مسیح ایک "بڑے سفید تخت" پر بیٹھ کر کرے گا (مکاشفہ ۲۰: ۱۱، ۱۲)۔ اس عبارت میں ہم "کتابِ حیات" کا ذکر پاتے ہیں۔ اس میں یہ خیال نہیں پیش کیا گیا ہے کہ خدا اس کتاب میں ہمارے گناہ قلمبند کیا چاہتا ہے، جیسا کہ اکثر لوگ قیاس کرتے ہیں، بلکہ وہ ہماری زندگی میں ایسے موقعوں کی تلاش کرتا ہے جن کے ذریعے سے وہ ہم کو زندگی عطا فرمائے۔ مقدس یوحنا کی انجیل میں اس انصاف کا تصور یوں پیش کیا گیا ہے کہ یہ فیصلہ ازلی فیصلہ ہے جسے اپنی روحانی اور اخلاقی ارتقاء کے مطابق ہم خود اپنے اوپر عاید کرتے ہیں۔" اور سزا کے حکم کا سبب یہ ہے کہ نور دنیا میں آیا اور آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا" (یوحنا ۳: ۱۹)۔ اس بیان کو چاہے کسی پیرائے میں پیش کیا جائے۔ اس میں کوئی اہمیت نہیں، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ مسیح ہماری عدالت کے لئے آئے گا۔ اس عدالت کا قیام محض زندگی اور موت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ہماری زندگی کا کارنامہ ہے جس سے ہماری صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔ گویا امتحان میں پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے انعام یافتہ لوگوں کا ریکارڈ ہے۔ مسیح کی عدالت سزا عائد کرنے کے لئے بلکہ الٰہی استحسان کے لئے ہے۔

اس موقع پر لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی نسبت کیا فیصلہ ہوگا جو شائد موقع نہ حاصل کرنے کی وجہ سے مسیح کو قبول نہ کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی نسبت زیادہ وثوق سے کہنا غیر ممکن ہے، لیکن ہم اس بات پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ "کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟" (پیدائش ۱۸: ۲۵) اور ہم اس بات سے مطمئن رہیں کہ



الٰہی انصاف میں انسانی انصاف سے کہیں زیادہ رحم پایا جاتا ہے۔ اور مسیح کا کفارہ ہمارے تصورات ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ ۱ پطرس ۳: ۱۹ اور ۴: ۶ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح نے اپنی صلیبی موت کے بعد ان لوگوں میں بھی انجیل کی منادی کی جو مر چکے تھے، اس لئے ان کی نجات کی نسبت خدا پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ہمیں خدا کی رحمت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ بہرحال ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ کوئی انسان چاہے وہ کسی حالت میں ہو مسیح کے فضل کے سوا اور کسی صورت سے معافی حاصل نہیں کر سکتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ حیاتِ ابدی سے محروم ہو جانے کا بھی امکان ہو سکتا ہے یا نہیں، کیونکہ یوحنا ۵: ۲۹ کے مطابق سزا کے لئے بھی قیامت مقرر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس موضوع پر کافی بے سمجھی کی باتیں کہی جاتی ہیں، اور ہمارا علم اس کی نسبت بہت زیادہ محدود ہے۔ لیکن کتابِ مقدس ہمیں خوب اچھی طرح آگاہ کر دیتی ہے کہ خدا کی حضوری سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جانا ممکن ہو سکتا ہے اور اگرچہ یہ خیال استعاروں کے ذریعے سے پیش کیا جاتا ہے، تاہم اس میں حقیقت ضرور ہے۔ کیونکہ خدا کسی انسان کو نیک بننے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان ہمیشہ خدا کی مخالفت کرتا رہے اور یوں حیاتِ ابدی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہنا درست نہیں ہو سکتا کہ کتابِ مقدس کی تنبیہیں اور خصوصاً خداوند یسوع مسیح کی تنبیہیں مشہور گنہگاروں اور کافروں کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ بلکہ یہ ان مذہبی لوگوں کے لئے بھی ہیں جو مطمئن بالذات ہیں اور یوں خدا کے مقصدوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

اس خیال کے ساتھ کہ مسیح دنیا کا انصاف کرتا ہے، اس کی دوسری آمد کا تصوّر
نہایت نزدیکی تعلق رکھتا ہے۔ یہاں پر بھی ہمیں احتیاط سے کام لینا لازمی ہے اور جس
قدر ہم اس کی نسبت علم رکھتے ہیں اس سے تجاوز کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ اس
مسئلہ کے سلسلے میں ہمیں ایک بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئیے اور وہ یہ کہ محبّت کے
سوا کسی اور صورت سے بُرائی پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔ صرف مسیح کی صلیب بُرے
ارادے کو مغلوب کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسے خیال سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئیے
کہ مسیح بُرائی کا خاتمہ انھیں چیزوں سے کرے گا جو اُس نے اپنی آزمائش کے وقت
رد کئے تھے۔ مسیح کی دوسری آمد کے بارے میں مختلف مقولات کا مطلب سمجھنے کے
لئے مسیح کے ان سنجیدہ الفاظ کو یاد رکھنا چاہئیے جو اس نے کائفا سے کہے تھے۔
"میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور
آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔" (متی ۲۶ : ۶۴، لوقا ۲۲ : ۶۹)۔
(جو مطلب "اس کے بعد" کے فقرے سے نکلتا ہے وہ نہایت صفائی سے ان دو
یونانی فقروں میں پایا جاتا ہے جو متی اور لوقا استعمال کرتے ہیں۔ ان سے
"زمانۂ مستقبل" کا مطلب نہیں لیا جا سکتا بلکہ ان سے "اسی گھڑی سے" مُراد
ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے میں ہمیں ایک اور بات سے ہوشیار رہنا چاہئیے اور
وہ یہ کہ ہمارا خداوند اپنے شاگردوں کو عمداً یہ سکھانا چاہتا تھا کہ وہ
اس کی جسمانی موجودگی کے بجائے ایک اور قسم کی موجودگی کو محسوس کریں
جو زیادہ مکمّل ہے۔ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند
ہے۔" (یوحنا ۱۶ : ۷)۔ اس معاملے میں ہمیں ابتدائی خیالات پر واپس جانے
کی کوشش نہیں کرنی چاہئیے، جو صحیح نہیں کہے جا سکتے۔ مسیح کی دوسری آمد کا
ماننا مسیحی عقیدے میں واقعی ایک اہم جگہ رکھتا ہے اور اگرچہ ہم یہ معلوم



کر سکیں کہ وہ کس طرح اور کب واپس آئے گا تو بھی اس بات میں کوئی شبہ نہیں
ہو سکتا کہ آخر میں مسیح کی محبّت ضرور گناہ پر فتحیاب ہوگی اور اُس کے وعدے
پورے ہوں گے۔" اور میں اگر زمین سے اونچے پر چڑھایا جاؤں تو سب کو
اپنے پاس کھینچوں گا۔" (یوحنا ۱۲ : ۳۲)

الغرض مسیح کا کام نتیجتاً ہمیشہ کی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابدی زندگی
کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف زمانۂ مستقبل میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا شروع
اسی زندگی میں ہوتا ہے۔ "جو کوئی اس پر ایمان لاتا ہمیشہ کی زندگی حاصل کرتا
ہے۔" (یوحنا ۳ : ۱۶)۔ "جو کوئی زندہ ہے اور مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ ابد
تک کبھی نہ مرے گا۔" (یوحنا ۱۱ : ۲۶)۔ "تمہاری زندگی مسیح کے ساتھ خدا
میں پوشیدہ ہے۔" (کلسیوں ۳ : ۳)۔ ابھی سے ہم زندہ مسیح کی زندگی میں
حصّہ دار ہیں۔ اس لئے ہم ایسی زندگی رکھتے ہیں جسے موت چھو نہیں سکتی —
"کیونکہ مجھ کو یقین ہے کہ خدا کی جو محبّت ہمارے خداوند یسوع مسیح میں ہے
اس سے ہم کو نہ موت جدا کر سکے گی نہ زندگی۔" (رومیوں ۸ : ۳۷)۔ اگرچہ
اس میں شبہ نہیں کہ ہمیشہ کی زندگی اب تک مکمّل طور پر نمودار نہیں ہوئی ہے۔
تاہم اس کا آغاز اس عالم میں ہو چکا ہے۔

یہ بیان ہمیں جسم کے جی اُٹھنے کے خیال کی طرف پھر واپس لاتا ہے۔ اس
امر میں بھی ہم ہوشیار رہیں کہ جس قدر ہم جانتے ہیں اس سے زیادہ کہنے کی
کوشش نہ کریں۔ ہم ایسے موضوعوں پر غور کر رہے ہیں جو ہمارے تجربے
سے باہر ہیں۔ اس لئے ہمارے تمام الفاظ اور کُل خیالات پورے طور سے
موزوں نہیں ہو سکتے۔ وہ جسم جو مسیح نے اپنے صعود سے پہلے چالیس دن
تک اختیار کیا تھا اس کی نظیر سے بھی خبردار رہنا چاہئیے۔ اگرچہ مسیح کا زندہ ہونا

اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ہم بھی زندہ ہوں گے۔ لیکن مسیح کا مختلف موقعوں پر ظاہر ہونا خاص حالات اور مقاصد کے لئے تھا جو ہماری طرف منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ اُس نے زندہ ہو کر کھانا کھایا تھا۔ لیکن ہم اپنے حق میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب ہم زندہ ہوں گے تو ہمارے جسموں کو کھانے کی ضرورت ہوگی۔ مقدس پولس بڑے اصرار سے کہتا ہے کہ ہم جسم کے ساتھ زندہ ہوں گے۔ اور اُس جسم کا ہمارے موجودہ جسم سے نہایت قریبی تعلق ہوگا۔ لیکن وہ نہایت پُرزور الفاظ میں کہتا ہے کہ "جو تو بوتا ہے یہ وہ جسم نہیں جو پیدا ہونے والا ہے"۔ "گوشت اور خون خدا کی بادشاہی کا وارث نہیں ہو سکتا"۔ "ہم سب بدل جائیں گے"۔ (۱کرنتھیوں ۱۵: ۳۷، ۵۰، ۵۱)۔ جب ہم جی اُٹھیں گے تو جسم کے ساتھ آئیں گے، لیکن وہ "روحانی جسم" ہوگا۔ یہ ایسا فقرہ ہے اگر ہم بے فکری سے استعمال نہ کریں ہمیشہ ہمیں یاد دلاتا رہے گا کہ ہم ایسی بات پر غور کر رہے ہیں جو ہمارے تجربے اور علم سے باہر ہے۔

ہمارے جسم ہماری شخصیت کے آلۂ کار ہیں، جن سے دوسرے ہم کو سمجھ سکتے ہیں اور ہم دوسروں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے جسم نہ ہوں تو ہماری شخصیتیں تنہا محدود اور نکمّی ہو جائیں گی اور ان میں ترقی کی قوت بالکل نہ رہے گی۔ مُردوں کی قیامت میں ہمیں اس امید کا یقین دلایا جاتا ہے کہ ہماری شخصیتوں کو کامل ہتھیار دئے جائیں گے اور ایسا رُوحانی جسم دیا جائے گا جو دنیاوی جسم کی حد بندیوں سے جن کے سبب سے ہماری روحانی آزادی جاتی رہتی ہے اور اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بری ہوگا۔ آنے والی دنیا کی زندگی موجودہ زندگی سے زیادہ عمدہ اور مکمل ہوگی اور اس میں ہماری



شخصیت زیادہ ترقی کر سکے گی۔ اپنے تبدیل شدہ جسم سے جو مسیح کے جلالی جسم کی طرح ہوگا ہم اس خوشی کو حاصل کریں گے جو مسیح میں پائی جاتی ہے اور ہم ہمیشہ اس کے ساتھ سکونت کریں گے جو ہمارے لئے سب سے بہتر ہوگا۔ (فلپیوں ۳: ۲۱، ۱: ۲۳)

# باب دہم

## رُوح القدس

منجی عزیز مسیح نے جب　　چھوڑ دیا دنیا کو
تسلی وہ بخش دیا تب　　تا ہادی ہو

رُوحِ پاک تسلی دینے کو　　آسمان سے آیا تھا
شکستہ دل میں رہنے کو　　وہ اُترا تھا

تقدیس کے رُوح، تو کر نگاہ　　کمزور فرزندوں پر
ہمارے دِلوں میں ہر گاہ　　سکونت کر

عقیدۂ تثلیث کے ساتھ ہم روح القدس کے عقیدہ پر غور کر چکے ہیں اور ایک مسیحی کے دل میں اس کی موجودگی کی طرف کئی مرتبہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب ہم روح القدس کی نسبت اپنے تصورات پر ذرا اور احتیاط سے غور کریں گے۔ اپنی دنیوی خدمت کے ایام میں مسیح نے شاگردوں کو روح القدس کی آمد کے لئے تیار کیا تھا اور اپنے جی اُٹھنے کے بعد اُن سے یہ کہا تھا کہ





روح القدس کے ملنے تک یروشلم میں ٹھہرے رہنا اور رُوح القدس کو حاصل کرنے کے بعد اپنا کام شروع کرنا (لوقا ۲۴ - ۴۹)۔ لہٰذا عید پنتکسُت کے بعد سے روح القدس کا حاصل کرنا مسیحیت کا ایک نہایت واضح نشان سمجھا جاتا تھا۔ (اعمال ۱۹: ۱ - ۷)۔ لیکن دراصل روح القدس کا کام عید پنتکست کے روز ہی شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ مسیحی کلیسیا اس بات کو ہمیشہ مانتی آئی ہے کہ عہد نامۂ عتیق کے نبیئین روح القدس کے وسیلے سے الہام حاصل کرتے تھے اور فی زمانہ بھی ہم یہ مانتے ہیں کہ جتنی چیزیں عمدہ، حقیقی اور خوبصورت ہیں وہ رُوح القدس سے آتی ہیں چاہے ان کا تعلق مسیحیت سے ہو یا نہ ہو۔ تاہم یسوع مسیح میں ایک شخص روح القدس کی بخشش ایسے بڑے پیمانے میں حاصل کر سکتا ہے جو اس نے مسیح کے پاس آنے سے پہلے حاصل کی ہو گی اور نہ مسیح سے جدا رہ کر حاصل کر سکتا ہے۔ مقدس یوحنا کے اس بعید الفہم قول کا کہ "رُوح القدس اب تک نازل نہیں ہوا تھا" (یوحنا ۷: ۳۹) یہی مطلب ہے۔

ہمارا راستباز ٹھہرنا اور ہماری تقدیس صرف اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کہ روح القدس ہمارے دلوں میں سکونت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے دلوں میں آکر ہماری زندگی کو بدل ڈالتا ہے۔ جب ہم اپنی زندگی میں اس بات کا تجربہ کرتے ہیں تو مسیحی مذہب محض ایک بے جان نظریہ نہیں رہتا بلکہ ایک جان دار حقیقت بن جاتا ہے۔ ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ روح القدس ہر ایمان دار کو دیا جاتا ہے اور ہر مسیحی کو روح القدس حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ روح القدس کی بخشش ایمان داروں کی شراکت کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے۔

روح القدس کا پہلا اثر ہماری زندگی پر یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارا

چال چلن بدل دیتا ہے۔ گلتیوں ۵ : ۲۲ وغیرہ ہیں جہاں مقدس پولس روح
کے پھل کا ذکر کرتا ہے یہ بات قابلِ غور ہے کہ لفظ "پھل" اسم واحد ہے جس سے
یہ مراد ہے کہ ہر مسیحی کو ان تمام صفتوں میں ترقی کرنی چاہیئے، حالانکہ یہ ضروری
نہیں کہ ان صفتوں کی ترقی یکساں ہو۔ کیونکہ مسیحی زندگی ایک مجموعہ ہے اور
ہم اس بات پر قناعت نہیں کر سکتے کہ اس کا کچھ حصہ تو حاصل کر لیں اور باقی
حصہ چھوڑ دیں۔ اگر ہم نے خدا کا روح واقعی حاصل کیا ہے تو ہمیں پوری مسیحی
زندگی میں ترقی کرتے جانا چاہیئے۔

ایک اور طریقہ جس سے روح القدس ہماری زندگی کو بدلتا اور ترقی
بخشتا ہے یہ ہے کہ وہ ہمیں دانائی، فہم، مشورہ، قوّت، معرفت، خدا پرستی،
اور خوفِ الٰہی کی ہفت گونہ نعمتیں عطا کرتا ہے۔ ان بخششوں سے ہماری
اندرونی زندگی بدل جاتی ہے اور صرف اسی تبدیلی سے ہم روح کے پھل
پیدا کر سکتے ہیں۔ زندگی اور چال چلن کی تبدیلی ایسی چیز نہیں جسے ہم مسیح کے
نمونے کو وفاداری سے اختیار کر کے حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ یہ روح القدس
کی بخشش ہے جسے ہم عطیہ کے طور پر قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں
روح القدس کے ساتھ تعاون بھی کرنا لازمی ہے، اور یہ ایسا کام ہے جس
میں روح القدس ہماری مدد نہیں کر سکتا بلکہ ہمیں خود اس فرض کو ادا کرنا ہے۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کلیسیا کی تعمیر کے لئے روح القدس مختلف
لوگوں کو مختلف قسم کی نعمتیں دیتا ہے۔ ہر شخص کو وہ یکساں بخششیں نہیں دیتا،
بلکہ ایک کو بولنے کی صفت دیتا ہے اور دوسرے کو تنظیم کی، ایک کو روشن
دماغ دیتا ہے جسے پانے والا خود ہی استعمال کر سکتا ہے، اور دوسرے کو
دوست بنانے کی خاص صفت۔ ہم سب کو یکساں نعمتیں نہیں دی جاتیں بلکہ ہر ایک



کو اس کام کے مطابق جو اس کے لئے مقرر ہے رُوح القدس نعمتیں تقسیم کرتا ہے (دیکھو
۱-کرنتھیوں ۱۲ : ۴ وغیرہ) بہرکیف ہمیں اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیئے کہ
ہماری نعمتوں کی حدبندی کے باعث ہم آسودہ خاطر رہ سکتے ہیں، بلکہ ہمیں ان
نعمتوں میں ترقی کرنی چاہیئے اور دراصل اگر ہم انہیں استعمال نہ کریں اور نہ ان
میں ترقی حاصل کریں تو وہ ضائع ہو سکتی ہیں۔ نیز اکثر موقعوں پر ہمیں ان نعمتوں
کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو بظاہر ہم میں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن روح القدس
کے فضل سے ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر ہم مقدسوں کی زندگیوں پر غور کریں تو ہم معلوم کریں گے کہ انہوں
نے روح القدس کی طاقت سے اکثر ان نعمتوں کو حاصل کیا جن سے وہ محروم
معلوم ہوتے تھے۔ پس روح القدس ہمیں ہر موقع کی ضرورت کے مطابق نعمتیں
عطا کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ روح القدس ہمارے خیالات اور اعمال کی ہدایت
کرتا ہے۔ زیادہ تر بے کار فکریں ہمیں اس لئے پریشان کرتی ہیں، کیونکہ ہم اس
اہم حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ چونکہ ہمیں اکثر قبل از قبل غور کئے بغیر فیصلے
کرنے پڑتے ہیں اور مشکل کاموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں پر روح القدس
کی صحیح ہدایت پر بھروسہ کرنا بجا ہے، لیکن ہمیں سچائی کے اس پہلو پر اتنا زور
نہیں دینا چاہیئے کہ ہم اس کے باقی پہلوؤں سے غافل ہو جائیں۔ مسیحی تواریخ
میں وقتاً فوقتاً ایسی تحریکیں نمایاں ہوئی ہیں جن میں اس اندرونی روشنی پر
زور دیا گیا جو روح القدس سے حاصل ہوتی ہے اور لوگوں نے کسی دوسرے
کی مداخلت سے انکار کیا، خواہ وہ کلیسیا کی ہو یا بائبل کی، اگرچہ ہر ایک ایماندار
کا روح القدس سے بلاواسطہ الہام حاصل کرنا مسیحیت کی ایک مرکزی حقیقت ہے۔

تاہم ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم سب ایسی غلط فہمی میں پھنس سکتے ہیں کہ اپنی خواہشوں اور
ارادوں کو رُوح القدس کی ہدایت کا نتیجہ سمجھنے لگیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اُس
کی ہدایت کے مفہوم کو غلط سمجھیں۔ اس لئے ہمیں کلیسیائی مشارکت کی تربیت اور
کتابِ مقدس کے مکاشفہ سے اپنے خیالات کی جانچ پڑتال ہمیشہ کرتے رہنا چاہیئے۔
اس کے علاوہ ایک اور قسم کے خطرہ سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ یعنی اپنی لاپروائی
اور سستی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہم روح القدس کی ہدایت پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔
عام طور پر روح القدس ایسے واعظ کی ہدایت نہیں کرتا جو پہلے سے مطالعہ وغیرہ
کر کے اپنا وعظ تیار نہیں کرتا۔ حالانکہ پُر احتیاط تیاری اور غور و فکر کے بعد
واعظ کے حق میں روح القدس کی ہدایت پر بھروسہ کرنا بجا ہے اور بہت سی
باتوں کی طرح اس میں بھی خدا معمولی طور پر کام کرتا ہے۔ تاکہ غیر معمولی طور پر معجزانہ
طریقے نہیں بلکہ عام طریقے استعمال کرتا ہے۔ پس اگر ہم دانش مند ہیں، تو بیشتر اس سے
کہ اپنے کسی خیال یا فعل کو روح کی ہدایت کا نتیجہ کہیں، اس پر اچھی طرح غور و فکر
کرنا نہایت ضروری ہے۔ بہر حال ہر حالت میں روح القدس کی ہدایت کی توقع
کرنا بجا ہے تاکہ ناحق فکر و پریشانی سے بچے رہیں۔

ہماری زندگی کو نیا بنانا روح القدس کا ایک اور کام ہے۔ وہ ہماری
اُن کوششوں سے جن کو ہم صدق دل سے اُس کے حضور پیش کرتے ہیں اُمید سے
زیادہ اچھے نتیجے پیدا کرتا ہے بلکہ وہ ہماری غلطیوں کو بھی اس طرح بدل دیتا ہے
کہ ان سے اُس کے کام میں مدد پہنچتی ہے۔ مقدس پولس ہمیں بتلاتا ہے کہ اسی قسم
کی تبدیلی روح القدس ہماری دعاؤں میں بھی پیدا کرتا ہے۔ ان کی کمزوری کو
اپنی قدرت و طاقت میں بدل دیتا ہے (رومیوں ۸: ۲۶) دراصل ہماری دعاؤں
اور کاموں میں اثر صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ روح القدس ہم میں



سکونت کرتا ہے۔ جب ہم اپنی دعاؤں اور کاموں پر غور کرتے ہیں تو وہ ہمیں
بہت کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم روح القدس پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں
اس ایمان کے باعث ہمت سے کام لینا چاہیئے یہ جانتے ہوئے کہ اگر ہم ایمان
رکھتے ہیں تو وہ ہماری کمزوری کو طاقت میں بدل سکتا ہے۔ ایسا ایمان سستی
اور لاپرواہی سے بچاتا ہے۔ اور بہتر کاموں، زیادہ شدید کوششوں
اور پُر ایمان دعاؤں کی ترغیب بخشتا ہے، جن میں ہم اپنے اوپر نہیں بلکہ
روح القدس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

جب ہم اپنی زندگی میں روح القدس کے کام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں
یاد رکھنا چاہیئے کہ روح القدس شخصی طور پر کام کرتا ہے۔ روح القدس اپنی
نعمتیں اس طرح نہیں دیتا جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کو انعام
دیتا ہے بلکہ جس طرح ایک شخص اپنے ذاتی تجربے، اثر و اختیار میں کسی دوسرے
کو حصہ دار بناتا ہے۔ اسی لئے اگرچہ روح القدس اپنے آپ کو مکمل طور پر
ہمیں ہر وقت دیتا رہتا ہے۔ تاہم جیسے جیسے ہم خود بڑھتے اور ترقی کرتے
ہیں اس کو زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اور خاص موقعوں کے لئے اُسے
خاص طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ایک نومرید اپنی زندگی میں ضرور
رُوح القدس کی برکت رکھتا ہے، کیونکہ دراصل روح القدس سے حاصل
کرنے ہی سے اُس کا دل پھر سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ ترقی کرتا ہے،
روح القدس سے زیادہ متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے
کہ استحکام کے وقت وہ روح القدس کی ایک نئی بخشش حاصل کرتا ہے،
پھر اگر بعد میں وہ کلیسیائی خدمت کے لئے بُلایا جاتا ہے تو روح القدس
اُسے مزید نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

روح القدس کی ہر نئی بخشش سے یہ مراد نہیں کہ اس کی پچھلی نعمتیں نامکمّل اور ناکافی تھیں بلکہ یہ کہ روح القدس کی ہر پچھلی نعمت دراصل کامل تو تھی لیکن نئی ضرورتوں اور نئے موقعوں کے سبب سے روح القدس کے ساتھ ہمارا تعلق اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

ہماری زندگی میں روح القدس کی موجودگی سے اس عالم کے زمان و مکان کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ہم اُس ماحول میں اُٹھا لئے جاتے ہیں جہاں خدا خود موجود ہے۔ چونکہ روح القدس ہماری زندگی میں آچکا ہے اس لئے "ہماری زندگی مسیح کے ساتھ خدا میں پوشیدہ ہے"؛ (کلسیوں ۳:۳) اور ہم ابدی زندگی کے وارث بن گئے ہیں۔



# باب یازدہم

## کلیسیا

ہمارے نہایت ہی مہربان باپ، ہم تیری پاک کیتھولک کلیسیا کے لئے نہایت عاجزی کے ساتھ تیری منّت کرتے ہیں کہ اُسے کامل سچّائی سے اور کامل اطمینان سے معمور کر۔ جہاں وہ خراب ہے اُسے صاف کر، جہاں غلطی پر ہے اس کی رہنمائی کر، جہاں اُس میں خامی ہے اُس کی اصلاح کر، جہاں وہ صحیح راہ پر ہے اُسے تقویت اور استقامت بخش، جہاں اُس میں کمی ہو اُسے پورا کر، جہاں اُس میں تفرقے ہوں اُنھیں دفع کر، ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے۔ آمین (آرچ بشپ لاڈ)

اب تک ہم خدا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کے نقطۂ نظر سے مسیحی تجربے پر غور کرتے آئے ہیں۔ دراصل یہ مسیحی تجربے کا صرف ایک پہلو ہے کیونکہ خدا کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے ہمارے تعلقات الٰہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی قائم ہوتے ہیں۔ اور جس حد تک ہم اس خاندانی زندگی میں شریک ہوتے ہیں اسی قدر ہم خدا کے بیٹے ہونے کا

مطلب سمجھ سکتے ہیں۔

عہدنامۂ عتیق میں خدا بنی اسرائیل ہی کے ذریعے سے لوگوں کو اپنے مکاشفے اور بخششیں عطا فرماتا تھا اور در اصل اُس دَور کے آخری حصہ میں مذہب کا شخصی پہلو پورے طور پر ظاہر ہوا تھا۔ اگرچہ ہمارا خداوند بلا تامّل اپنے وقت کے یہودی مذہب کے رہبروں کی بُرائیاں ظاہر کرتا تھا، تاہم چونکہ وہ موسیٰ کے جانشین تھے، (متی ۲۳ : ۲) اس لئے ان کے اقتدار کا اعتراف کرتا تھا اور جہاں تک اس کو موقع ملتا تھا یہودیوں کے رسوم میں اور بالخصوص اُن کی عیدوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ اپنی خاص "جماعت" یا "کلیسیا" (یہ دونوں الفاظ ایک ہی مطلب رکھتے ہیں) قائم کرنے کا بھی ذکر کرتا تھا (متی ۱۶ : ۱۸)۔ چنانچہ اُس نے اپنی خدمت کا بڑا حصہ ان بارہ کو تیار کرنے میں صرف کیا جو اس کی جماعت کے مرکزی ارکان بننے والے تھے۔ اعمال ۱ : ۳ میں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جو ایام مسیح کی قیامت اور صعود کے درمیان گذرے ان میں وہ اپنے شاگردوں سے "خدا کی بادشاہی کا ذکر کرتا رہا"۔ اور اگرچہ اس فقرے کی تشریح واضح طور پر نہیں کی جا سکتی، تاہم اس فقرے سے کسی خاص جماعت کی طرف ضرور اشارہ ہے، اور اس قسم کی تشریح مسیحیوں کی ابتدائی تواریخ سے بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔

اعمال کی کتاب میں ہر جگہ یہ بات بلا ثبوت مان لی جاتی ہے کہ ہر شخص جو مسیح پر ایمان لاتا ہے بپتسمہ سے مسیحی رفاقت میں شریک ہوتا ہے۔ پنتکوست کے دن، مقدس پطرس نے اپنی تقریر کے بعد لوگوں سے یہ کہا کہ "توبہ کرو اور تم میں سے ہر ایک اپنے گناہوں کی معافی کے لئے یسوع مسیح کے نام پر بپتسمہ لے" (اعمال ۲ : ۳۸)۔ اور اس کے بعد ہی ہم پڑھتے ہیں



کہ "وہ رسولوں سے تعلیم پانے اور رفاقت رکھنے ۔ ۔ ۔ ۔ میں مشغول رہے" (اعمال ۲ : ۴۲)۔ اس رفاقت یا جماعت کے بارے میں یہ خیال اعمال میں شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے۔

مقدّس پولُس اس خیال کو اور آگے بڑھاتا ہے۔ وہ اس رفاقت میں کسی قسم کے تفرقہ کو گوارا نہیں کر سکتا، اور جب اُسے کرنتھس کے فرقوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اُن سے صاف کہہ دیتا ہے کہ تم مسیح کو تقسیم کر رہے ہو (۱۔کرنتھ ۱ : ۱۳)۔ ابتدائی کلیسیا میں جب یہودی رسوم کو قائم رکھنے یا رد کرنے پر بحث ہو رہی تھی تو شائد اس کا ایک آسان فیصلہ یہ ہو سکتا تھا کہ دو جماعتیں یا کلیسیائیں قائم کر دی جاتیں، ایک یہودی اور دوسری غیر یہودی۔ لیکن کسی رسول نے اس قسم کے فیصلے کا قطعی خیال نہیں کیا۔ کیونکہ ایمان داروں کا خاندان صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ ان کے شدید اختلافات کے باوجود اُنھوں نے ہمیشہ ان سچائیوں پر زور دیا جن پر وہ متفق ہو سکتے تھے اور یوں کلیسیا میں اتحاد قائم رکھا گیا۔ مقدّس پولُس کہتا ہے کہ مسیحی افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں جو اس کی صحت کے لئے ضروری ہیں، اور اس جسم کا ہر ایک عضو کسی نہ کسی خاص کام کے لئے مقصود ہے۔ حالانکہ جسم سے علیحدہ ہو کر وہ عنقریب بیکار رہے۔ (دیکھو رومیوں ۱۲ : ۴، ۱کرنتھ ۱۲ : ۱۲ وغیرہ، افسں ۴ : ۱۶)۔ اور کلسیوں ۱ : ۲۴ میں مقدّس پولس کے یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "اس کے بدن یعنی کلیسیا کی خاطر" یعنی جس طرح ہمارا بدن ایک ایسا آلہ ہے جس سے ہماری شخصیت ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح کلیسیا ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے مسیح اپنے آپ کو دنیا پر ظاہر کرتا اور اپنے کام کو انجام دیتا ہے جیسا کہ اپنے ایام خدمت میں وہ اپنے جسم کے ذریعے کیا کرتا تھا۔ اس بات کو ہم اپنے تجربے میں بالکل صحیح پاتے ہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیحیوں ہی سے دوسرے لوگ مسیح

کو جان سکتے ہیں اور دوسرے مسیحیوں کی مدد سے ہم مسیحی زندگی میں ترقی کر سکتے ہیں۔ کلیسیا کے مقدسین کی صحبت میں ہم "مسیح کی محبت معلوم کر سکتے اور جان سکتے ہیں" (افسیوں ۳: ۱۸، ۱۹)۔

مزید برآں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کلیسیا ہی کی مدد سے ہمارے زیادہ تر روحانی اور جماعتی کام پورے کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مشنری چاہے کتنا ہی توانا اور ذی اثر کیوں نہ ہو کلیسیا سے مالی امداد کا حاجتمند ہوگا اور جیسے جیسے اس کا کام ترقی کرے گا اُسے کلیسیائی مددگاروں کی ضرورت ہوگی، بائبل اور دیگر کتابوں کی چھپوائی کے لئے بھی اُسے کلیسیا ہی کا سہارا ڈھونڈنا ہوگا، اور ان سب سے زیادہ اُسے کلیسیا کی دعاؤں کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ تنہا رہتا ہے تو اس کا اثر بہت کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جنھیں مسیحی افراد نہیں کر سکتے مگر مسیحی جماعت انھیں بآسانی کر سکتی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اگر مسیح ایسی رفاقت خود قائم نہ کرتا تو مسیحیوں کو مجبوراً اسے قائم کرنا پڑتا۔

اب یہ سوال لازمی ہو جاتا ہے کہ "کلیسیا ہے کیا چیز؟" اس سوال کے مختلف جواب پیش کئے جاتے ہیں۔ کلیسیا کی جو تعریف دعائے عام میں عشاء ربانی کی ترتیب کے شکرانہ میں پائی جاتی ہے، جہاں کلیسیا کو "ایمانداروں کی مبارک جماعت" کہا گیا ہے معقول تو معلوم ہوتی ہے، لیکن کلیسیا کی یہ لفظی تعریف ہماری عملی ضروریات کے لئے کافی نہیں، کیونکہ ہم کلیسیا کے ظاہری نشانات بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس بیان کو پسند کرتے ہیں جسے ۱۹۲۷ء میں لوزان کانفرنس (Lausanne Conference) کی تیسری رپورٹ میں کلیسیا کے مختلف فرقوں کے نمائندوں نے متحدہ طور پر پیش کیا ہے۔

"رپورٹ ۳ کلیسیا کا مقصد۔ خدا جس نے دنیا کی نجات کے لئے ہمیں



انجیل عطا فرمائی ہے، اس نے اپنی کلیسیا کو اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ اپنے نمونہ اور تعلیم سے اس نجات کے اثر کی گواہی دے۔ زندہ خدا کی کلیسیا کا تقرر انسان کے انفرادی یا اجتماعی ارادے سے نہیں ہوا، بلکہ الٰہی ارادے سے ہوا۔ حالانکہ خدا اپنے ارادے کو انسانی ارادے کے ذریعے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ مسیح اس کلیسیا کا صدر ہے، اور روح القدس کلیسیا کی ابد تک قائم رہنے والی قوت ہے۔

"عہد نامۂ جدید کے مطابق کلیسیا جو ایمانداروں کی رفاقت ہے، نئے عہد کی نسل، مسیح کا بدن اور خدا کی ہیکل کہلاتی ہے جو رسولوں اور نبیوں کی بنیاد پر قائم ہے، اور یسوع مسیح خود کونے کے سرے کا پتھر ہے۔

"کلیسیا خدا کا ایک مخصوص آلۂ کار ہے، جس سے مسیح روح القدس کے وسیلے سے ایمان کے ذریعے خدا اور انسانوں کے درمیان میل قائم کرتا ہے، ان کی مرضی کو خدا کی حکومت کے ماتحت کرتا ہے اور اپنے فضل سے اُن کی تقدیس کرتا ہے اور محبت اور خدمت کی روح سے ان کے درمیان اتفاق قائم کرتا ہے، تاکہ اس کی پُرجلال بادشاہت کے قائم ہونے تک وہ خدا کے گواہ اور اس کی حکومت کے پھیلانے میں اس کے شریک کار بنے رہیں۔

"چونکہ مسیح صرف ایک ہے اور اس میں زندگی بھی ایک ہے اور روح القدس ایک ہے جو تمام سچائی میں ہدایت کرتا ہے اس لئے کلیسیا بھی صرف ایک ہو سکتی ہے۔ جو پاک، کیتھولک اور رسولی کلیسیا کہلاتی ہے۔

"زمین پر کلیسیا چند خصوصیات رکھتی ہے جن سے لوگ اُسے پہچان سکتے ہیں۔ اُن میں سے کم از کم حسب ذیل خصوصیات رسولوں کے وقت سے

موجود ہیں۔

۱۔ خدا کے کلام کو جو کتابِ مقدس میں پایا جاتا ہے قبول کرنا اور اُس پر ایمان لانا جس کی ترجمانی کلیسیا اور ہر فرد کے لئے روح القدس کرتا ہے۔

۲۔ الٰہی تجسد پر ایمان لانا اور اقرار کرنا کہ خدا واحد مسیح میں بنی نوع انسان پر ظاہر ہوا۔

۳۔ مسیح کے اس حکم پر عمل کرنا کہ انجیل کی بشارت تمام بنی نوع انسان میں پھیلائی جائے۔

۴۔ سکرامنٹوں کی پابندی۔

۵۔ کلیسیا میں پاسبانی خدمت، کلام کی منادی اور سکرامنٹوں کا اہتمام۔

۶۔ دعا، عبادت، فضل کے تمام وسیلوں، پاکیزگی کی جستجو، اور انسانی خدمت میں رفاقت۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض جماعتیں جو مذکورہ بالا خصوصیات نہیں رکھتیں کلیسیا میں شریک نہیں کی جاسکتیں۔ حالانکہ اُنھیں مسیحی سمجھنا لازمی ہے، اور شاید ایسی جماعتوں کو کلیسیا سے باہر رکھنا بجا ہے، کیونکہ اگر ہم واقعی کلیسیا کی ایک کارآمد تعریف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایسی جماعتیں ظاہری کلیسیا کے دائرے سے باہر ہیں، اگرچہ اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ نجات سے محروم ہیں یا مسیح ان میں کام نہیں کرتا۔ بہر کیف وہ کیتھولک کلیسیا کی رفاقت سے باہر ہیں۔ لیکن لوزان کے بیان سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ اکثر جماعتیں جو اس وقت آپس میں



رفاقت نہیں رکھتیں، کیتھولک کلیسیا کے دائرہ میں جگہ رکھتی ہیں۔ فی زمانہ ایسی کوئی کلیسیا نہیں جسے پورے معنوں میں کیتھولک کہا جا سکتا ہے۔ گو کہ بعض جماعتیں اور جماعتوں کی بہ نسبت اس معیار کے زیادہ قریب ہیں، اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم کلیسیا کی اس جماعت سے وفاداری رکھیں جسے ہم حقیقی معیار کے قریب تر اور مسیح کے اصل مقاصد کے مطابق پاتے ہیں اور اس وفاداری میں مستحکم رہ کر دوسری شاخوں کے ساتھ زیادہ وسیع محبت قائم کرنے کی کوشش کریں تاکہ کلیسیا واقعی خدا کے مقصد کو پورا کر سکے۔

ہمارے عقیدوں میں کلیسیا کے لئے چار اسمائے صفت استعمال کئے گئے ہیں جن پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ "ایک، پاک، کیتھولک، اور رسولی کلیسیا"۔ ہم اپنے عقیدوں میں اقرار کرتے ہیں کہ کلیسیا صرف "ایک" ہے، اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ خدا ایک متحدہ کلیسیا کے ذریعے سے اپنے کام کرتا ہے۔ ایسی ہی کلیسیا بجا طور پر ہمارے عقیدے میں جگہ رکھ سکتی ہے، یہ کلیسیا نہ تو انگلیکن، نہ پریسبیٹرین نہ رومن کلیسیا کہلائی جا سکتی ہے بلکہ ایک ایسی کلیسیا ہے جو خدا کی مرضی سے موافقت رکھتی ہے۔ ہمارے عقیدے کا یہ حصہ ہمیں مسیح کی کلیسیا کے اتحاد کے لئے کوشش اور دعا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن ہم یاد رکھیں کہ ہر ایک ایماندار مسیح میں زندگی رکھتا ہے لہٰذا مسیح میں ہونے کے سبب سے ایمانداروں کے درمیان اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ اب دراصل اس بات کی ضرورت نہیں کہ کلیسیا میں روحانی اتحاد قائم کیا جائے بلکہ یہ کہ اس روحانی اتحاد کو جو پہلے سے ہمارے درمیان موجود ہے کلیسیائی زندگی میں ظاہر کیا جائے۔ جب ہم کلیسیا کے اس بڑے حقیقت پر غور کرتے ہیں جو اب باآرام ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہاں تمام اختلافات

ختم ہو چکے ہیں۔ اس لئے جن اختلافات کو ہم اس دنیا میں محسوس کرتے ہیں کلیسیا کے صرف ایک چھوٹے حصے پر اثر کر سکتے ہیں۔

دوم، کلیسیا پاک ہے۔ عنقریب تمام زبانوں میں لفظِ "پاک" کا اصلی مطلب "الٰہی کاموں کے لئے علیحدہ کر دینا" سمجھا گیا ہے۔ یہ لفظ اس بنیادی مفہوم کو ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔ اسی معنی میں ہم "پاک کتاب" یا "پاک میز" کے فقرے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مذہبی تصوّرات کے ارتقا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز الٰہی کاموں کے لئے مخصوص ہو سکتی ہے تو اس کی مخصوصیت اخلاقی خوبی کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ ہم ایک میز کو تو اخلاقی طور پر نیک یا بد نہیں کہہ سکتے لیکن ایک انسان کو نیک یا بد کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اگرچہ "پاک میز" کے فقرے میں لفظ "پاک" کا مفہوم الٰہی کام کے لئے علیحدہ کئے جانے پر محدود ہے، تاہم "پاک انسان" یا "پاک کلیسیا" جیسے فقروں میں نیک اخلاقی کا تصوّر زیادہ اہم ہے۔ حالانکہ لفظِ پاک کے اصلی معنی کو (یعنی کسی چیز کو الٰہی کاموں کے لئے مخصوص کر دینا) فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کلیسیا بالکل پاک اور بے عیب ہے، کیونکہ کلیسیا میں نیکی اور بدی ہمیشہ ملی جلی رہتی ہے۔ کلیسیا کی تواریخ میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کو پاک ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کلیسیا ہمیشہ ایک ایسی طاقت رہی ہے جس سے پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ آج تک کلیسیا ہی ان کوششوں میں اخلاقی قوّت پیدا کر رہی ہے جن سے دنیا کو پاک و صاف کرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

سوم، کلیسیا کیتھولک (Catholic) ہے۔ یہ لفظ کسی قدر تشریح کی ضرورت رکھتا ہے۔ چونکہ روم کی کلیسیا اس لفظ کو اپنے



ہی لئے استعمال کرنا پسند کرتی ہے، اس لئے اس لفظ کی نسبت غلط فہمی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ دراصل اس لفظ میں دو قسم کے تصوّرات پائے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کلیسیا سب انسانوں، قوموں اور زبانوں کے لئے ہے یعنی افریقہ، ہندوستان، انگلستان اور دیگر ممالک میں صرف ایک ہی کلیسیا ہو سکتی ہے۔ چاہے ہم اپنے عقیدوں کا مطلب مختلف طریقوں سے بیان کریں اور عبادت کے بھی مختلف طریقے اختیار کریں، تاہم مسیحی رفاقت ہر جگہ ایک ہی ہو سکتی ہے، اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں قائم کیا جا سکتا جس طرح کہ ابتدائی کلیسیا میں یہودی اور غیر یہودی مسیحیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا غلط سمجھا گیا اسی طرح فی زمانہ بھی کالے اور سفید، ایشیائی اور یورپی مسیحیوں کے لئے مختلف کلیسیائیں قائم کرنا غلط ہے۔ کلیسیا صرف ایک ہو سکتی ہے، جسے تمام مسیحیوں کو اپنی آغوش میں لینا چاہیئے، اور اُن کے تمام تفرقوں پر فائق ہونا چاہیئے جس میں تمام لوگ ایک دوسرے کے ہم خیال بننے پر مجبور نہ کئے جائیں بلکہ ایسا اتحاد قائم کیا جائے جس میں مسیحیوں کے تمام اختلافات جمع کئے جا سکیں۔ چونکہ کلیسیا اس معنی میں کیتھولک کہلاتی ہے کہ اس میں تمام قومیں شامل ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا کلیسیا کو اس لحاظ سے بھی کیتھولک ہونا چاہیئے کہ اس میں ہر زمانے کے مسیحی شریک کئے جائیں۔ زمانۂ حال کی کلیسیا وہی ہے جو مسیحیت کی ابتدا میں قائم کی گئی تھی۔ ہم ہر زمانے کے مقدّسین کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں۔ ہماری زندگیاں اور ہمارے کام ان مقدّسین کی زندگیوں اور کاموں سے مسلسل ہیں جو گذر چکے ہیں، اور ان نسلوں میں جاری رہتے ہیں جو آنے والی ہیں۔ جس طرح افریقیوں اور ہندوستانیوں کو مسیح کی کلیسیا کے لئے اپنی اپنی نذریں لانا ضروری ہے اسی طرح پہلی صدی اور بیسویں

صدی کے مسیحیوں کو ایک دوسرے کی ممیز خصوصیات کی ضرورت ہے۔ لفظ "کیتھولک" کے مفہوم میں دوسرا تصور یہ ہے کہ کلیسیا مکمل عقیدہ لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ اسمیں اضافہ یا تخفیف قطعی نہ کیا جائے۔ ہمارے زیادہ تر فرقہ وارانہ اختلافات کا سبب یہی ہے کہ ہم سچائی کے بعض حصّوں پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ اس کے دیگر پہلوؤں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خصوصاً اس مسئلہ کو کہ انجیل میں مسیحی افراد اور مسیحی رفاقت کی کیا حیثیت ہے، لیکن کیتھولک کلیسیا جو خدا کی مرضی سے مطابقت رکھتی ہے کل عقیدے کو صحیح توازن کے ساتھ سکھاتی ہے۔

کلیسیا کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ "رسولی" ہے۔ یعنی کلیسیا کا تسلسل رسولوں کے زمانے کی کلیسیا سے جاری ہے۔ ایک ہی کلیسیا قدیم زمانے سے نجات کا الٰہی پیام دیتی چلی آرہی ہے۔ چونکہ کلیسیا رسولوں پر قائم ہے، اس لئے ہمیں ہر جدّت کو رسولوں کی تعلیم کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جو ہماری ہدایت کے لئے عہدنامہ جدید میں قلم بند کی گئی ہے۔ لوگوں کے سامنے انجیل کی بشارت کے ذریعوں اور طریقوں میں ضرور تبدیلیاں ہوں گی، کیونکہ ہر زمانے میں انجیل کو نئے پیرائے میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انجیل جس پر کلیسیا قائم کی گئی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی نجات کے وسیلے میں کوئی لازمی جدّت ہوسکتی ہے جس سے خداوند کے رسول ناواقف تھے۔

کلیسیا اب تک نہ تو مکمل ہے نہ کامل، تاہم وہ اس دنیا میں خدا کے طریقِ عمل کا ایک جزو ہے جس کے سبب سے وہ انجیل کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔ کلیسیا ہی کے ذریعے سے ہماری زندگی کامل بن سکتی ہے۔



لیکن جس قدر ہم ترقی کرتے جاتے ہیں ہمارے فرائض بھی کلیسیا میں بڑھتے جاتے ہیں اور خدا ہم سے اُمید رکھتا ہے کہ ہم بھی کلیسیا کی خدمت کریں "تاکہ ہم" اسی کے ساتھ جو سر ہے یعنی مسیح کے ساتھ پیوستہ ہو کر ہر طرح سے بڑھتے جائیں جس سے سارا بدن ہر ایک جوڑ کی مدد سے پیوستہ ہو کر اور گٹھ کر اس تاثیر کے موافق جو بقدر ہر حصہ ہوتی ہے اپنے آپ کو بڑھاتا ہے تاکہ محبت میں اپنی ترقی کرتا جائے"۔ (افسیوں ۴: ۱۵، ۱۶)

# بابِ دوازدہم

## اصولِ سکرامنٹ

**سوال۔** اس لفظ سکرامنٹ سے کیا مراد ہے ؟

**جواب۔** وہ کسی اندرونی اور روحانی فضل کا جو ہمیں دیا جاتا ہے بیرونی اور ظاہری نشان ہے، اور خود مسیح کی طرف سے اس لئے مقرر ہوا کہ اُس فضل کے حاصل کرنے کا وسیلہ اور اُس کے مل جانے کے یقین کا باعث ہو۔

(کلیسیائی کاٹیکزم)

جب کبھی ہم کسی خیال یا جذبہ کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کسی مادّی ذریعے سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنے جسم سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً جب ہم خوش ہوتے ہیں تو مُسکراتے ہیں۔ بعض اوقات ہم ایسی مادّی چیز استعمال کرتے ہیں جو ہمارے جسم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ مثلاً اس وقت میں کاغذ استعمال کر رہا ہوں اور اس پر کالے نشان لگا رہا ہوں جن سے آپ میرے خیالات کو سمجھ سکتے ہیں یا ہم کسی حرکت سے کام لیتے ہیں مثلاً جب دو شخص ملتے ہیں تو ہاتھ ملا کر اپنی دوستی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ہم بولتے وقت بھی اپنے جسموں کو اور ہوا کو (کیونکہ ہوا بھی مادّی شے ہے)





استعمال کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس زندگی میں روحانی باتیں ہمیشہ مادّی ذرائع سے بیان کی جاتی ہیں۔ اس طرزِ بیان کو ہم اصول سکرامنٹی کہتے ہیں، اور ان ذریعوں کو جن کو ہم استعمال کرتے ہیں نشانات، علامات یا سکرامنٹس (Sacraments) کہتے ہیں۔

بعض اوقات سیکرامنٹس یا علامات روحانی معنی سے نہایت نزدیکی تعلق رکھتے ہیں اور بعض موقعوں پر وہ کوئی خاص معنی رکھتی ہیں جس پر ہم آپس میں اتفاق کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ترش روئی سے ہر جگہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ناراضگی مراد ہے۔ لیکن دو شخص جو مختلف زبانیں بولتے ہیں ایک ہی آواز کا بالکل فرق مطلب سمجھ سکتے اور تیسرے شخص کے لئے جو کوئی اور زبان بولتا ہے وہ آواز بالکل بےمعنی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہمیں ان علامات یا سکرامنٹس کو اچھّی طرح سمجھ لینا چاہئیے۔

اکثر باتوں میں کسی علامت یا سکرامنٹ کے مطلب کا انحصار اس حاکم پر ہوتا ہے جو اسے صادر کرتا ہے۔ مثلاً کسی حکومت کا نوٹ یا سکّہ حکومت کے حکم سے بنایا جاتا ہے۔ لیکن ایک جعلی نوٹ میں چاہے اصلی نوٹ کی سب باتیں موجود ہوں اور چاہے ایک جعلی سکہ اصلی سکّہ سے زیادہ قیمتی کیوں نہ ہو تاہم یہ دونوں اصلی علامت کی قدر و قیمت نہیں رکھ سکتے اس لئے کہ وہ صحیح منبعِ موثق سے صدارت نہیں رکھتے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نوٹ یا سکّہ کا استعمال ناجائز قرار دیا جائیگا۔

اسی طرح مذہب کی روحانی باتوں کو مادّی علامات کی مدد سے سمجھانا معقول ٹھہرایا جا سکتا ہے، اور دراصل اس طرزِ بیان کے بغیر کام کبھی نہیں چل سکتا۔ بعض اوقات لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف روحانی مذہب قائم کرنے کی

کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن انسان محض روح نہیں ہے بلکہ اس کی روح کو اپنی خصوصیات ظاہر کرنے کے لئے جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم بائبل یا کسی اور کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی مادی چیزوں کے ذریعے سے روحانی باتوں کو دیکھتے ہیں اور جب ہم دعا یا وعظ میں الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اُن میں بھی وہی بات پائی جاتی ہے، در اصل ہماری زندگی میں مادی چیزوں کے بغیر روحانی باتوں کا اظہار بالکل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے جو لوگ کلیسیا کی سکرامنٹس کو استعمال نہیں کرتے اُنھیں اپنی روحانی باتوں کو ظاہر کرنے کے لئے دوسرے ذرائع ایجاد کرنے پڑتے ہیں؛ اور بعض مسیحی جماعتیں اس کام کے لئے خاص رسمیں مقرر کرتی ہیں اور ان سے وہی کام لیتی ہیں جو ہم سکرامنٹس سے لیتے ہیں۔ آگے چل کر ہم کلیسیا کی دو خاص سکرامنٹس کا بیان تفصیل کے ساتھ پیش کریں گے، لیکن اس فصل میں سکرامنٹ کے چند ضروری اصولوں پر غور کیا جائے گا۔

اولاً، اگر ہم ان سکرامنٹس کو واجب طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اگر آپ یہ کتاب کسی ایسے شخص کو دیں جو اُردو نہیں جانتا تو یہ اس کے لئے بیکار چیز ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ شائد وہ اس سے آگ جلا سکتا ہے یا اس کے ورقوں سے تھیلیاں بنا سکتا ہے۔ لیکن آپ چونکہ اُردو زبان سے واقف ہیں اس لئے آپ ان خیالات کو جو اس میں رقم کئے گئے ہیں سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ سکرامنٹس کو استعمال کرنے سے پہلے ہم ان کا مطلب صحیح طور پر سمجھ لیں تاکہ اُن کے ناجائز استعمال سے محفوظ رہیں۔



بہر حال یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی علامت کا مطلب جانتے ہوئے بھی ہم اس کا ناجائز استعمال کریں۔ مثلاً میں آپ کا دوست بننے کا بہانہ کرکے آپ کے سامنے دوستی کی تمام علامتیں پیش کر سکتا ہوں، لیکن میرا اصلی مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو نقصان پہنچاؤں۔ اسی طرح ہم خدا کی سکرامنٹس کا بھی ناجائز استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان میں سچے دل سے شریک ہو رہے ہیں جس حال کہ حقیقت میں ہم ان کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ پس اگر ہم خدا کو یوں فریب دیتے ہیں تو ہم اپنے ہی اوپر فتویٰ عاید کرتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی مانند بننے اور اس کی یگانگت حاصل کرنے سے محروم رکھتے ہیں۔ اسی لئے سکرامنٹس میں غیر مناسب طریقے سے شریک ہونے کے خطرے سے ہم آگاہ کئے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم ان کے قطعی لائق نہیں لیکن اسی وجہ سے تو ہم ان میں شریک ہوتے ہیں تاکہ خدا کے فضل کو حاصل کریں۔ بہر حال ان میں مناسب طریقے سے شریک ہونا لازمی ہے جس سے یہ مراد ہے کہ ہم سکرامنٹس کا صحیح مطلب سمجھ کر اُنھیں خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کریں۔

اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سکرامنٹس اور علامات کو استعمال کرتے وقت وہ روحانی جذبات جن کا ہم اظہار کرتے ہیں زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ جب ہم کسی دوست سے ہاتھ ملاتے ہیں یا اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں تو اس کے لئے ہماری محبّت یقیناً بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ان سکرامنٹس کا ہم صحیح استعمال کرتے ہیں، تو ہمارے روحانی جذبات ضرور بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں۔

ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ سکرامنٹی علامات کا استعمال

بعض طریقوں سے تو صحیح ہوتا ہے اور بعض طریقوں سے غلط بھی ہوتا ہے ہم کسی نشان سے وہی چیز سمجھ سکتے ہیں جس کو وہ ظاہر کرتا ہے۔ ہم اس اصول کو اُلٹ نہیں سکتے۔ مثلاً ہم کسی نقشہ کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ "یہ انگلستان ہے"۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انگلستان ایک نقشہ ہے۔ (دیکھو ۱ کرنتھ ۱۱: ۲۷۔ ۳۴)

دوم، ہم بعض کام خاص موقعوں پر سکرامنٹی طور پر کرتے ہیں۔ لیکن ان کاموں کا عمل میں لایا جانا ان موقعوں سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا۔ مثلاً نکاح کی رسم میں ایک خاص موقع پر مرد عورت سے کہتا ہے کہ "میں اپنا سارا دنیوی مال تجھے دیتا ہوں"۔ لیکن عین اس موقع پر جب کہ دولہا ان الفاظ کو اپنی زبان سے نکالتا ہے وہ اس وعدے کو دراصل عمل میں نہیں لاتا۔ سکرامنٹی طرزِ کلام کی تشریح میں ہمیں اس بات سے ہوشیار رہنا چاہیئے کہ ہم الفاظ کا غلط استعمال نہ کریں۔

اب ہم سکرامنٹوں کے بیان میں ایک اہم مقام پر آپہنچے ہیں۔ اس لئے یہاں لوزان کانفرنسوں کی رپورٹس کی چھٹی رپورٹ سے اقتباس نقل کرنا بہتر ہوگا۔ "ہم یہ مانتے ہیں کہ سکرامنٹس میں ایک بیرونی نشان ہوتا ہے اور ایک اندرونی فضل ہوتا ہے اور یہ سکرامنٹس خدا کے فضل کے وسیلے ہیں جن سے خدا ہم میں غیرمرئی طور پر کام کرتا ہے"۔ سکرامنٹس کا خاص مطلب یہ ہے کہ خدا ان میں ہم کو اپنے فضل کا بیرونی نشان دیتا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ وہ ہماری روحوں میں غیرمرئی طور پر کام کر رہا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ سکرامنٹ میں ہمارا کام کیا ہو سکتا ہے، ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ خدا اس کے ذریعے سے ہم میں اور ہمارے واسطے کیا کر رہا ہے۔ لیکن اس



بات کی پہچان ہمیں صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ سکرامنٹ کا نشان خدا کا مقرر کیا ہوا نشان ہو۔ ایسی ہی سکرامنٹ "جائز" کہی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ "جائز ہونے" کا مطلب "موثر ہونے" کے مطلب سے فرق ہے۔ مثال کے طور پر ہم حسبِ ذیل بیان کو پیش کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انگلستان میں ایک مصنوعی پادری نے کئی نکاح کرا دیئے۔ چونکہ وہ شخص غیر تقرّر یافتہ تھا اس لئے حکومت کی نظر میں ایسے نکاح ناجائز اور غیر قانونی تھے۔ لیکن ہم میں سے کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جو نکاح اُس نے پڑھے وہ با اثر تھے۔ یعنی جن کاموں کے لئے وہ پڑھے گئے تھے وہ پورے ہوئے۔ کلیسیائی اتّحاد کے تبصرے کے بعض سوالات کو سمجھنے میں یہ امتیاز نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہمیں دو قابلِ لحاظ باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

اوّلاً۔ اگر سکرامنٹس فضل کے مؤثر ذرائع ہیں تاہم خدا دوسرے طریقوں سے بھی اپنا فضل عطا فرماتا ہے، اور بہر حال ہمیں فضل کے ان وسیلوں سے غافل نہیں رہنا چاہیئے، ہم یہ نہ سوچیں کہ جو لوگ ان میں سے ایک کو بھی استعمال نہیں کرتے وہ الٰہی فضل سے مستثنیٰ کر دیئے جاتے ہیں۔

دوم۔ فضل کے حاصل کرنے کا انحصار سکرامنٹ ہی پر قائم ہے، نہ کہ عامل کی سیرت پر۔ خادم الدّین محض ایک آلہ ہے جس سے خدا کام کرتا ہے۔ اور چاہے خادم الدّین کتنا ہی نالائق ہو خدا اپنے فضل کے اثر کو سکرامنٹ میں قائم رکھتا ہے اور اُس کا یقین دلاتا ہے۔ اسی معنی میں یہ فقرہ "کسی کام کے عمل میں لائے جانے کے سبب استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرکیف سکرامنٹ کو مؤثر بنانے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ اوّلاً، سکرامنٹ لینے والے

کی ایسی حالت ہونی چاہیئے کہ جس سے وہ فضل کو حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی اُسے فضل کو ایمان سے قبول کرنا چاہیئے۔ اسی صورت سے ہم الٰہی فضل کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اور دوئم سکرامنٹ میں شریک ہونے والے کا یہ ارادہ ہونا چاہیئے کہ وہ خدا کی مرضی پر عمل کرے گا۔ پس اگر کوئی بے اعتقاد انسان محض تضحیک کے ارادے سے مسیحی سکرامنٹس کی نقل اُتارتا ہے تو اگرچہ وہ اُن تمام لوازمات کو پورا کرے جو جائز سکرامنٹ کے لئے ضروری ہیں تو بھی وہ جائز نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ شخص سکرامنٹ کی صحیح نیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اگر ایک خادم الدّین بیس آدمیوں کو بپتسمہ دے رہا ہے تو دس کے لئے صحیح نیت رکھ سکتا ہے اور دس کے لئے صحیح نیت نہ رکھ سکتا۔ یہ بات اس مثال سے اور واضح ہو سکتی ہے کہ ہم ایک ایسے جج کا تصوّر کریں جو اپنے گھر میں کسی کھیل میں حصّہ لے رہا ہو، اور اس کھیل میں اگر وہ کسی پر موت کی سزا عائد کرتا ہے تو وہ فتویٰ جائز یا مؤثر نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس کا یہ ارادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قانونی فتویٰ سمجھا جائے۔ لیکن جب وقت جج عدالت میں بیٹھتا ہے تو وہ یہ ارادہ نہیں کر سکتا کہ ایک قیدی پر سزا کا فتویٰ لگائے اور دوسرے کو بلا سزا چھوڑ دے۔

چونکہ سکرامنٹ کے بیرونی نشان کو مسیح خود مقرّر کرتا ہے اس لئے سکرامنٹ اور اس رسم میں جسے کلیسیا خود مقرّر کرتی ہے بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک تو خدا کی دی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری انسان خود مقرّر کرتا ہے۔ ایسی سکرامنٹس جن کے بیرونی نشان خود مسیح نے مقرّر کئے ہیں دو ہیں۔ بپتسمہ اور عشائے ربّانی، جن کا بیان عہد نامۂ جدید میں پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہم چند ایسی رسموں کا بھی اعتراف کرتے ہیں



جن کو مسیح نے نہیں بلکہ کلیسیا نے مقرّر کیا ہے۔ مثلاً نکاح اور خدّام الدین کے تقرر کی رسمیں۔ ان رسموں کو بھی ہم الٰہی فضل حاصل کرنے کے مؤثّر وسیلے مان سکتے ہیں۔

بپتسمہ اور عشائے ربّانی کی نسبت اینگلیکن جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ "نجات کے لئے یہ سکرامنٹس عام طور سے ضروری ہیں"۔ اس میں "عام طور" کے فقرے سے "ہر ایک مسیحی" مراد ہے۔ ہر ایک مسیحی کے لئے تقرّر پاسبانی یا نکاح کی رسم ضروری نہیں۔

لیکن بپتسمہ لینا اور عشائے ربّانی میں شریک ہونا ہر ایک مسیحی کے لئے لازمی ہے۔ اسی سبب سے ہم ان کو "عام طور" سے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لفظ "ضروری" سے بھی چند دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں بعض مسیحی سکرامنٹس کو بالکل استعمال نہیں کرتے۔ تو کیا اُن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نجات سے محروم رہیں گے؟ اپنے عقیدے کو پیش کرنے میں ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم دوسروں پر الزام لگائیں۔ بلکہ یہ کہ اپنے عقیدے کی سچّائی کو دوسروں کی خدمت میں پیش کریں۔ پس ہم دوسروں کو خدا کے فیصلے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہی اُن کا صحیح فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن یہ کہنا مناسب ہو گا کہ اگر ہم فضل کے کسی ذریعے سے غافل رہتے ہیں تو ہم اپنی ہی روحانی صحت کو خطرے میں ڈالتے ہیں، اور روحانی صحت کے بغیر ہم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا ان سب کو جو اس کے پاس آتے ہیں قبول کرتا ہے اور ان تمام نمایاں آثار کے لئے خدا کا شکر کرنا چاہیئے جن سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ خدا ان لوگوں میں بھی کام کرتا ہے جو سکرامنٹس کا استعمال نہیں کرتے، تاہم ہمیں

ماننا پڑے گا کہ فضل کے ان وسیلوں کو استعمال نہ کرنے کے سبب سے وہ ضرور نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ اس نقصان کو ہم اپنی زندگی میں بھی محسوس کرتے ہیں جب ہم خود ان فضل کے وسیلوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ پس جب ہم ایسے وسیلوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں جن سے خدا ہماری زندگیوں میں اپنا مقصد پورا کرتا ہے تو ہمیں فضل کے ان تمام وسیلوں کے استعمال پر زور دینا چاہیئے جو اس نے خود مقرر کئے ہیں۔

سکرامنٹس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ ان موقعوں پر ہماری مدد کریں، جبکہ ہم اپنے ایمان میں کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ ایسے موقعے ہر شخص کی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ جب اس قسم کی وقت ہمارے سامنے حائل ہو جاتی ہے تو کوئی اور چیز سے مدد کی اُمید نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ بائیبل بھی ہماری مدد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہماری روحانی صحت جاتی رہتی ہے۔ لیکن ان موقعوں پر اگر ہم سکرامنٹس میں ثابت قدم رہتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ خدا اس حالت میں بھی ہماری مدد کرتا ہے اور اپنا فضل قائم رکھتا ہے تو ہماری حالت درست ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں سکرامنٹس اس حالت میں بھی ہماری مدد کرتی ہیں جبکہ ہم اپنے آپ کو روحانی طور پر مضبوط محسوس کرتے ہیں تاکہ ہم خدا کے فضل کو اور بڑے پیمانے میں حاصل کریں۔

بالآخر سکرامنٹس ہی کے ذریعے سے ہم کلیسیا کی رفاقت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ فضل کے دوسرے ذرائع سے لوگ زیادہ تر انفرادی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن سکرامنٹس کے لئے رفاقت لازمی ہے۔

پس جب ہم سکرامنٹس پر غور کرتے ہیں تو ان میں تین باتیں وابستہ



پاتے ہیں۔ اوّلاً ہمارے ذاتی فرائض جو سب سے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ دوئم۔ مسیحی رفاقت کو ظاہر کرنے کے لئے کلیسیا کے فرائض۔ اور سوئم، الٰہی فضل جس سے ہمیں خدا کی مہر و محبّت کا یقین ہوتا ہے۔

# باب سیزدہم

## پاک بپتسمہ

اے خدا بخش دے کہ ہم سب جن پر صلیب کا نشان بنایا گیا ہے مسیح مصلوب کے ایمان کا اقرار کرنے سے نہ شرمائیں، اور اُس کے جھنڈے تلے گناہ، دنیا، اور شیطان سے مردانہ لڑیں، اور جیتے دم تک اُس کے وفادار سپاہی اور خدمت گذار بنے رہیں۔ آمین

بپتسمہ کی رسم کلیسیائی رفاقت میں مسیحی زندگی کا آغاز ہے۔ ہر سوسائٹی میں کوئی خاص نشان مقرر کیا جاتا ہے۔ جس سے ممبروں اور غیر ممبروں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ بعض غیر ممبران بھی اس سوسائٹی کے بعض فوائد سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور ایک حد تک ممبر بننے سے پہلے سوسائٹی کی رفاقت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا خلعت پانے سے ہی اسکاوٹ کے دستہ کی برادری میں شریک ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح قبل اس کے کہ ایک شخص کلیسیا کی برادری میں شریک کیا جائے (خصوصاً تبلیغی حلقوں میں) اس کے لئے تیاری کے ایام مقرر کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس دوران میں بھی وہ کلیسیائی زندگی میں شریک ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں





کہ وہ خدا کے فضل سے فیضیاب بھی ہوتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہدنامہ جدید میں بپتسمہ کے ساتھ مسیح پر ایمان لانا فرض کر لیا جاتا ہے اور بپتسمہ ہی کے ذریعے سے اس ایمان کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ انجیلِ مقدس میں اس رسم کا ذکر متی ۲۸: ۱۹ اور مرقس ۱۶:۱۶ میں پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ یہ عبارتیں بعد میں آنے والی کلیسیا کے رواج کا پرتو ہیں، لیکن چونکہ بپتسمہ کی رسم شروع سے کل کلیسیا میں عالمگیر طور پر مروج رہی ہے، اس لئے یہ نہایت ممکن ہو سکتا ہے کہ مسیح نے خود بپتسمہ کی رسم کو قائم کیا ہو، اور ہم اس معاملہ میں یقینی طور پر کلیسیا کی ہدایت پر جو روح القدس اُسے بخشتا ہے بھروسہ کر سکتے ہیں۔ مقدس پولس جب اپنے نومریدوں کو خط لکھتا ہے تو انھیں بار بار بپتسمہ کے مقصد کی طرف مخاطب کرتا ہے۔

اوّلاً بپتسمہ امیدوار کا ایک خاص فعل ہے۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے وہ خدا، کلیسیا اور دنیا کے آگے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مسیح کو قبول کرتا ہے اور اس بات کا ارادہ کرتا ہے کہ اپنی پرانی زندگی کو ترک کر کے آئندہ ہمیشہ مسیح کے لئے جئے گا۔ چنانچہ بپتسمہ ایک ایسا نشان ہے جس سے ایک مسیحی دنیا کے لوگوں میں پہچانا جا سکتا ہے۔ مسیح کا اس طرح علانیہ اقرار کرتے وقت امیدوار اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ وہ مسیحی عقیدے کو قبول کرتا ہے، ہر قسم کی برائی کو ترک کرتا ہے۔ اور خدا کی پاک مرضی پر چلنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس سکرامنٹ میں یہی امیدوار کا خاص حصہ ہے۔

دوم۔ بپتسمہ کلیسیا کا وہ فعل ہے جس میں نومرید کا مسیحی رفاقت میں استقبال کیا جاتا ہے، اور کلیسیا خدا سے دعا کرتی ہے کہ نومرید ایمان میں ثابت قدم

رہے اور وہ ماں باپ کے ذریعے جو اس کے ضامن مقرر ہوتے ہیں نومرید کی مزید تعلیم اور نگرانی کا انتظام کرتی ہے ۔

سوم بپتسمہ ایک الٰہی فعل ہے جو اس کے سکرامنٹ کا سب سے اہم جزو ہے ۔ اس سکرامنٹ کے ذریعے خدا اُمیدوار کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے قبول کرتا ہے ۔ اسے مسیح کے بدن کا عضو اور آسمان کی بادشاہت کا وارث بناتا ہے ۔ خدا اُمیدوار کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اس کو قبول کرتا ہے ۔ اس کے تمام گناہ معاف کرتا ہے اور اس کی ضرورت کے موافق فضل عطا کرتا ہے ۔

اس صورت سے بپتسمہ اس بات کا نشان اور ذریعہ ہے جس سے پرانی زندگی نئی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ پُرانا انسان مر جاتا ہے اور نیا انسان جی اُٹھتا ہے ۔ بپتسمہ سے مسیحی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور آئندہ کی نشوونما کے لیے خدا کے فضل کا یقین دلایا جاتا ہے ۔ پس بپتسمہ میں امیدوار اپنی مرضی کے مطابق الٰہی فضل سے مسیح کے بدن کا عضو بن جاتا ہے اور اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے نوزادگی حاصل کرلی ۔ سکرامنٹی طور پر ہم کسی خاص موقع کی طرف اشارہ کرکے کہہ سکتے ہیں کہ اُس شخص نے فلاں وقت نئی زندگی حاصل کرلی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں روحانی تبدیلی درحقیقت اسی موقع پر عمل میں آئی ہوگی ۔ خدا ہم میں نئی زندگی کا بیج ڈالتا ہے ، مگر اس زندگی کے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے ہمیں خدا کے ساتھ تعاون کرنا لازمی ہے ورنہ وہ زندگی معطل رہ جاتی ہے ۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا اپنے وعدوں کو ضرور پورا کرتا ہے ۔ اگر ان میں کمی رہ جاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس فضل سے کام نہیں لیا جو خدا ہم کو دیتا ہے ۔ اس امر میں اور [illegible] اپنے دوسرے امور میں بھی کلیسیا کو بالفرض یہ مان لینا



پڑتا ہے کہ امیدوار سچائی اور صدق دل سے بپتسمہ کا خواستگار ہے ۔

علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ بپتسمہ ایک علامتی مفہوم بھی رکھتا ہے ۔ مثلاً ہم گرجہ کی تقدیس کرتے اور اُسے خاص طور سے پاک قرار دیتے ہیں تاکہ تمام جگہیں پاک ہو جائیں ۔ ہم سبت کے دن کو پاک سمجھ کر اس کی تعظیم کرتے ہیں تاکہ زندگی کے تمام اوقات پاک ہو جائیں ۔ اسی طرح بپتسمہ میں مسیحیوں کو مخصوص کیا جاتا ہے تاکہ تمام لوگ پاک ہو جائیں ۔

بعض لوگ بچّوں کے بپتسمہ پر اعتراض کرتے اور کہتے ہیں کہ انھیں اس لئے نہیں دینا چاہیئے کیونکہ وہ اس بات کی سمجھ نہیں رکھتے کہ انھیں خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ۔ یہ سچ ہے کہ عہدنامۂ جدید میں اس کے بارے میں کوئی خاص ہدایت نہیں پائی جاتی ، لیکن پورے پورے خاندان کے بپتسمہ دیے جانے کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی کلیسیا میں بچّوں کو بھی بپتسمہ دیا جاتا تھا ۔ اس امر میں دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہم بپتسمہ میں اپنے فرائض کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں اور خدا کے کام کا کافی خیال نہیں رکھتے ۔ (دیکھو اعمال ۱۶: ۳۳ ، ۱ کرنتھ ۱: ۱۶) ۔ اگرچہ بچّہ خدا کی طرف رجوع نہیں کر سکتا تو بھی خدا بچّے کو اپنا فضل دے سکتا ہے کلیسیا نے اس اعتراض کا جواب اس واقعہ میں بھی پایا جب مسیح نے چھوٹے بچّوں کو گود میں لے کر انھیں برکت دی ۔ (مرقس ۱۰: ۱۳-۱۶) ۔ اگرچہ وہ بچّے مسیح کی طرف مناسب طور پر رجوع نہیں لا سکتے تاہم یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کی برکت بے اثر تھی ۔ مسیحی والدین کے بچّوں کو کلیسیائی عبادت کی پوری تعلیم دی جانی چاہیئے ، اور جس وقت وہ اپنے والدین کی محافظت اور محبت کا احساس کرنے لگیں ، انھیں خدا کی پدرانہ محافظت اور محبت کے وعدے

اور سچائی کی پہچان دلائی جانی چاہیئے۔

بپتسمہ کے بعد عموماً لوگ مستحکم کئے جاتے ہیں۔ اصولی طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ استحکام کو بپتسمہ کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔ حالانکہ اب عام طور پر بپتسمہ کے کئی سال بعد لوگوں کو مستحکم کیا جاتا ہے عملی طور پر استحکام اس لئے مفید ہے کہ بپتسمہ کے بعد بچّہ یا نومرید کو مزید تعلیم دی جا سکتی ہے اور اس بات کا نشان ہے کہ امیدوار کلیسیا کا پورا شریک بن گیا ہے۔ اس رسم کی بھی تشریح ان تین طریقوں سے ہو سکتی ہے جس طرح بپتسمہ کی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔ جب اُمیدوار مزید واقفیت اور تجربہ کی روشنی میں خدا کی طرف اپنے رجوع کی تصدیق کرتا ہے تو کلیسیا اس کو ایک پورے ذمہ دار شریک کی حیثیت میں اپنی رفاقت میں شامل کرتی ہے، اور خدا اس کو روح القدس کی اور بڑی بڑی نعمتوں کا یقین دلاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے بڑے فرائض کو ادا کر سکے۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ استحکام کا ظاہری نشان یعنی بشپ کا سر پر ہاتھ رکھنا وہی نشان ہے جو خادمانِ دین کے تقرر کا ظاہری نشان ہے۔ کلیسیا کا ایک مستحکم شریک اس دنیا میں کہانت کا عہدہ رکھتا جس طرح کہ خادم الدین کلیسیا میں کہانت کا عہدہ رکھتا ہے۔ وہ دنیا میں خدا کا نمائندہ بن جاتا ہے اور خدا کے حضور دنیا کا۔ یوں کلیسیا تمام ایمانداروں کی کہانت کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔

# باب چہاردہم

## عشائے ربّانی

اے خُدا! تو جس نے ایک عجیب سکرامنٹ میں اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کی اذیت کی دائمی یادگار رکھ چھوڑی ہے۔ یہ بخش کہ ہم اس کے بدن اور خون کے پاک بھیدوں کی ایسی تعظیم کریں کہ ہم اپنے اندر تیرے فدیئے کے پھل ہمیشہ محسوس کر سکیں۔ ہمارے خداوند یسوع مسیح کے فیصلہ سے۔ آمین (قدیم رومی کالکٹ)

چونکہ پاک بپتسمہ مسیحی رفاقت میں داخل ہونے کی سکرامنٹ ہے، اس لئے کبھی وہ دہرائی نہیں جا سکتی۔ لیکن ہمیں ایک ایسی سکرامنٹ کی بھی ضرورت ہے جو مسیحی رفاقت میں ہماری زندگی کو مضبوط بنا سکتی ہے۔ اسی غرض سے جس رات کہ ہمارا خداوند حوالہ کر دیا گیا، اس نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری کھانا کھاتے وقت پاک عشا کی رسم مقرّر کی۔ اس وقت سے مسیحی لوگ اس رسم کو مانتے آئے ہیں اور اس سے روحانی قوّت حاصل کرتے رہے ہیں اور وہ ان کی عبادت کا سب سے اعلیٰ جزو اور ان کی رفاقت کا نشان بن گئی۔ لیکن اس کے علاوہ یہ سکرامنٹ ہمارے بعض نہایت شدید اختلافات

کام کر بھی رہی ہے جن سے ہم ہمیشہ شرمندہ ہوتے رہتے ہیں۔ بہر کیف اگرچہ ہم اکثر باتوں پر اتفاق نہیں رکھتے تاہم ان سے کہیں زیادہ باتوں پر اتفاق رکھتے ہیں۔ اس سکرامنٹ میں شریک ہوتے وقت اگر ہم ان باتوں پر اپنا خیال جمائیں جن پر ہمارا ایمان ہے تو اُسے اپنی روحوں کے لئے ہر مرتبہ زیادہ فضل کے باعث پائیں گے۔ اور اگر ہم اُن باتوں کا زیادہ خیال کریں جن کو ہم نہیں مانتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ سکرامنٹ محض ایک ظاہری اور بے پھل رسم بن کر رہ جائے۔ لہٰذا اس فصل میں ہم اس رسم کے متعلق ایک عام پسند سمجھوتہ قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہم عشائے ربانی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کریں حالانکہ اس سکرامنٹ کا پورا مطلب صرف بعد کے تجربے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم اس تحقیق کو ا۔کرنتھیوں ۱۱: ۱۷۔ ۳۴، مرقس ۱۴: ۲۲۔ ۲۵ اور یوحنا ۱۳ کے مطالعے سے شروع کریں۔ عشائے ربانی خواہ خود عید فسح ہو یا اس سے ایک رات پہلے عمل میں آئی ہو، ہر حالت میں یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ رسم عید فسح سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زمانے کے نیک یہودیوں کو عید فسح ہر سال ایک بڑی رہائی کی یاد دلاتی تھی جو اُن کو خدا سے ملی تھی۔ اور اس عہد کی بھی جسے خدا نے ان کے ساتھ قائم کیا تھا۔ وہ انکو یہ یقین دلاتی ہے کہ خدا اپنے وعدوں میں صادق القول ہے اور ہر دشواری میں خدا سے وفادار رہنے کی نئی ہمت اور طاقت بخشتی ہے۔ اس عہد میں قربانی کا برہ ان کی باہمی شرکت اور خدا کے ساتھ اُن کے رشتے کا ثبوت تھا۔ انھیں باتوں کے پیش نظر ہمارا خداوند صلیب کی اذیت اُٹھانے سے پہلے عید فسح میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ لہٰذا جس رات وہ حوالہ کر دیا گیا اس نے روٹی لی اور شکر



کر کے توڑی اور اپنے شاگردوں کو دے کر کہا "لو کھاؤ، یہ میرا بدن ہے جو تمہارے لئے دیا گیا"۔ دراصل اس وقت اپنے آپ کو نذر کر کے اپنے جسم کو لوگوں میں تقسیم کر رہا تھا کیونکہ اس نے یہودہ اور سردار کاہنوں کو اُن کی مرضی پوری کرنے دی اور اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دیا۔ قربانی کا برہ انسان اور خدا کے درمیان نامکمل رشتہ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ لیکن مسیح کی قربانی نے خدا اور انسان کے درمیان کامل رشتہ قائم کر دیا۔ کیونکہ مسیح خود قربانی کا برہ تھا اسی طرح اُس نے پیالہ کو لیا اور شکر کر کے اُن کو دیا اور کہا "اس میں سے پیو، کیونکہ نئے عہد کا یہ میرا خون ہے جو تمہارے اور بہتوں کے لئے بہایا جاتا ہے"۔ اس نے یہ الفاظ اس لئے کہے کیونکہ اس نے اپنی جان نذر گذرانی (اور ہم جانتے ہیں کہ خون ہمیشہ جان کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے) تاکہ اس کے ذریعے سے لوگ گناہوں کی معافی حاصل کریں اور خدا کے ساتھ اُن کا میل ہو جائے۔ ان الفاظ کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے ہم مقدس پولس کی اس عبارت پر غور کریں "یہ پیالہ میرے خون میں نیا عہد ہے" (ا۔کرنتھ ۱۱: ۲۵)۔ اس فقرے میں لفظ "ہے" کی جگہ "ہو گیا" یا "ظاہر کرتا ہے" کے فقرے نہیں لگائے جا سکتے۔ کیونکہ یہ لفظ سکرامنٹی معنی رکھتا ہے۔ پس اس عجیب اور بے نظیر رسم کے ذریعے سے ہمارا خداوند اس بڑی قربانی کا مطلب بیان کرتا ہے جو اس نے ہمارے واسطے صلیب پر نذر گذرانی پنتکست کے دن سے اس کے حکم کے بموجب کلیسیا مسیح کے اس سنجیدہ عمل کو دوہراتی چلی آ رہی ہے۔ اس رسم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہمیں خداوند کی قربانی کی یاد دلائے "کیونکہ جب کبھی تم یہ روٹی کھاتے اور اس پیالے میں سے پیتے ہو تو خداوند کی موت کا اظہار کرتے ہو" (ا۔کرنتھ ۱۱: ۲۶) پس جب کبھی ہم عشائے ربانی کی رسم ادا کرتے ہیں تو اپنے خداوند کی اذیت اور موت

یاد رکھیں۔ ہم اپنے آپ کو بار بار یاد دلاتے رہیں کہ ہمارے ایمان کی حقیقت اور ہماری روحانی زندگی کا مرکز مسیح کی صلیب، اس کی خود انکاری اور اس کی قربانی ہے۔ کیونکہ ہم اس بڑے کام کو جو مسیح نے ہمارے واسطے کیا جس کے بغیر ہماری نجات ناممکن تھی بہت جلد اور بڑی آسانی سے بھول سکتے ہیں۔

عشائے ربّانی خدا کے حضور بھی مسیح کی اذیت کی یادگار ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو اس کی یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہ کہ ہمیں خود اس کی یادآوری کرنے اور خدا کے حضور مسیح کی قربانی کا واسطہ دینے کی ضرورت۔ یہی دعا کے حق میں بھی سچ ہے۔ ہم خدا کو اپنی ضرورتیں یاد دلانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے ہی لئے دعا کرتے ہیں۔ لہٰذا انفرادی حیثیت سے اور جماعتی حیثیت سے بھی ہمیں خدا کے حضور مسیح کی قربانی کا واسطہ ہمیشہ دیتے رہنا چاہیئے۔ ایسا کرنا نہ صرف ہمارے ہی لئے ضروری ہے بلکہ کل دنیا کے لئے ضروری ہے۔ تمام شفاعتی دعائیں ہمارے اس فرض کا ایک اہم حصہ مانی جاتی ہیں اور ہم اسے عشائے ربّانی میں جو کلیسیا کی شفاعت کا ایک بڑا موقع ہے، خاص طور پر عمل میں لاتے ہیں۔

جب ہم اس طرح مسیح کی قربانی کی یادگار مناتے ہیں تو ہمارے دل اس کے اس بڑے کام کے لئے حمد اور شکرگزاری سے بھر جاتے ہیں اور یہ ہماری عبادت محض التجائی اور شفاعتی نہیں رہتی بلکہ "حمد و شکر کی قربانی" بن جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس رسم کو یوکرست (EUCHARIST) یعنی عبادتِ شکرگذاری کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اب تک ہم اس امر پہ غور کرتے آئے ہیں کہ عشائے ربّانی میں ہمارا کیا فرض ہے۔ یعنی یہ کہ ہم مسیح کی اذیت اور موت کو یاد رکھیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ خدا



اس میں کیا کر رہا ہے زیادہ اہم بات ہے۔ بالاخانہ میں مسیح نے روٹی اور مے اپنے شاگردوں کو دی اور اب وہ روٹی اور مے ہمیں دیتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم اس بیان پر پھر غور کریں گے جو یوحنّا ۶ میں پایا جاتا ہے۔ جہاں ہمارا خداوند کہتا ہے کہ "جب تک تم ابنِ آدم کا گوشت نہ کھاؤ اور اس کا خون نہ پیو تم میں زندگی نہیں" (آیت ۵۳)۔ کھانا اور پینا دو ایسے افعال ہیں جن سے ہم کوئی چیز باہر سے اپنے اندر لیتے ہیں۔ ہضم کرتے اور اسے اپنے جسم کا حصّہ بنا لیتے ہیں۔ اسی لئے ہمارا خداوند کہتا ہے کہ جب تک ہم اُس کی انسانیت اور زندگی کو حاصل نہیں کرتے ہم میں حقیقی زندگی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس قدر بڑا دعویٰ ہے کہ بہت سے سننے والوں کا اُسے برداشت نہ کر سکنا حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہوتی، اور لکھا ہے کہ "وہ اس کے ساتھ نہ رہے"۔ ہمیں یہ فرض کرنا ضروری نہیں کہ وہ اس بات کو غلط سمجھے یا اس کے لفظی معنی لے رہے تھے۔ کسی طریقے سے مسیح کی شخصیت کو اپنے اندر لینا حقیقت میں ابنِ آدم کا گوشت کھانا اور خون پینا کہا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ بائیبل کے مطالعہ یا دھیان سے ہو یا فطرت پر غور کرنے سے یا اُسے اپنے ہم جنسوں میں دیکھنے سے یا کسی اور طریقے سے ہو۔ لیکن سکرامنٹی طور پر پاک عشائے ربّانی میں وہ اعلیٰ ترین طریقے سے اپنے آپ کو ہمیں دیتا ہے۔ جب ہم ان پاک عناصر کو لیتے ہیں تو ہم اسے ایمان سے کھاتے ہیں اور اس کی زندگی ہماری روحوں میں داخل ہوتی ہے اور ہم اپنے گناہوں کی معافی اور اس کی اذیت کے باقی سب فائدے حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے یہ رسم "پاک شراکت" کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس سکرامنٹ سے ہمارا اس کے ساتھ میل ہو جاتا ہے۔ اس سے "ہمارے بدن اُس کے بدن سے پاک صاف کئے جاتے ہیں اور ہماری روحیں اس کے بیش قیمت خون سے دھوئی جاتی ہیں تاکہ

ہم اس میں اور وہ ہم میں ہمیشہ بسے "۔

جب ہم اس سے مل جاتے ہیں تو ہمارا میل کلیسیا کے دوسرے ممبروں کے ساتھ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک روٹی اور ایک پیالہ کی شرکت سے یہ رسم کلیسیائی رفاقت کا اعلیٰ ترین عمل بن جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم اس جماعت کے ساتھ جو موجود ہوتی ہے رفاقت محسوس کرتے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ اس سکرامنٹ میں شرکت کرتے ہیں ان کی رفاقت کو اپنے تجربے میں بڑھتے دیکھتے ہیں۔ اور جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کل دنیا کے مسیحی اسی ایک سکرامنٹ میں شریک ہو رہے ہیں اور مسیح میں ہم سے مل رہے ہیں تو ہم کل دنیا کی کلیسیا کے ساتھ رفاقت محسوس کرتے ہیں۔

سوم، ہم ان مقدسین کی بھی رفاقت محسوس کرتے ہیں جو ابدی آرام میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہ اس دنیا سے گذر کر مسیح میں زندہ ہیں۔ اس لئے مسیح میں ہمارا ان کے ساتھ بھی اتصال قائم ہو جاتا ہے۔ غرضکہ اس سکرامنٹ میں ہم دونوں جہان کی کل کلیسیا کی یگانگت مسیح میں محسوس کرتے ہیں اور "فرشتوں اور مقرب فرشتوں اور کل آسمانی گروہ کے ساتھ اس کے جلیل نام کی حمد و تعظیم کرتے ہیں "۔

جب ہمارا اتصال مسیح کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے تو ہم اپنے آپ کو انفرادی طور پر اور کلیسیا کی حیثیت سے خدا کے حضور نذر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اپنے گناہوں کے سبب سے بذاتِ خود کوئی قربانی خدا کے حضور گذراننے کے لائق نہیں۔ لیکن جب ہم مسیح کے ساتھ یگانگت رکھتے ہیں اور ہماری زندگیاں اس کی زندگی میں شامل کی جاتی ہیں اور وہ ہم میں بستا ہے اور ہم اس کی کامل قربانی میں شریک ہو سکتے ہیں تو ہم "اپنے آپ کو جسم و روح سمیت خدا کے حضور نذر گذران سکتے ہیں



تاکہ اس کے لئے ذی عقل مقدس زندہ قربانی " بن سکتے ہیں۔ اس قربانی کو ہم شکرگذاری کی قربانی کہہ سکتے ہیں۔ اس عبادت میں ہم اپنا ایمان، اپنا استغفار، اپنی پرستش اور اپنا مال یعنی سب کچھ خدا کو نذر کرتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر مسیح میں ہونے کے سبب سے ہم اپنے آپ کو نذر کرتے ہیں۔ چونکہ خدا نے خود اپنے آپ کو نذر کیا اس لئے وہ ہمیں توفیق دیتا ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو اس کے حضور میں پیش کریں۔

جب مسیحی لوگ عشائے ربانی میں شریک ہوتے ہیں تو اس عبادت میں مسیح کی موجودگی اور اس کی طاقت کو خاص طور سے محسوس کرتے ہیں، حالانکہ اس موجودگی کی کیفیت بیان کرنے کی کوششوں کے سبب سے کلیسیا میں کافی نااتفاقی ہو چکی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے موقعوں میں مسیح ہمارے ساتھ موجود نہیں رہتا۔ بلکہ یوکرسٹ میں اس کی موجودگی کا احساس اسی لئے دیا جاتا ہے کہ ہم اس کی موجودگی کو ہر وقت اور ہر جگہ محسوس کر سکیں۔ یوکرسٹ میں مسیح کی موجودگی کے احساس کا ایک اور سبب ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے کمرے میں کوئی دوسرا شخص بھی ہو اور ہم اس کی موجودگی کو محسوس نہ کر سکیں لیکن جب وہ ہم سے باتیں کرنی شروع کرتا ہے تو ہم فوراً اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم میں سے زیادہ لوگ مسیح کی موجودگی کی بابت ہر وقت نہیں سوچ سکتے۔ لہٰذا انہیں خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ ہم اس کی موجودگی پر صرف خیال جما سکتے ہیں اور اس کی موجودگی کی فضا کو محسوس کر سکتے ہیں جس میں دراصل ہم ہر وقت رہتے ہیں۔

اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ مسیح کی موجودگی پاک روٹی اور مے سے یا تو نہایت نزدیکی تعلق رکھتی ہے یا ان کے اندر پائی جاتی ہے۔ چونکہ خداوند کے بدن

اور خون کی سکرامنٹ بننے کے لئے ان دو چیزوں کی تقدیس کی جاتی ہے۔ اس لئے ہم ان کو معمولی روٹی اور مے نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ ان کی قدر زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور ہمیں اس کی اتنی ہی عزت کرنی پڑتی ہے جتنی کہ اس ملک کی عزت کرتے ہیں جس کا جھنڈا مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح روٹی اور مے یوکرسٹ میں نئی قدر حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے ہم صحیح طور پر مسیح کی زندگی کو محسوس کر سکتے ہیں۔

بعض لوگ اس خیال کو بہتر سمجھتے ہیں کہ مسیح کی موجودگی پوری عبادت میں پائی جاتی ہے جس میں مسیح خود روٹی اور مے دیتا ہے، جس طرح کہ اُس نے بالاخانہ میں شاگردوں کو دیا تھا۔ یہ خیال بھی مسیح کی موجودگی کی نسبت درست ہے، اور اس سے عبادت کے دوران میں مسیح کی موجودگی کا کوئی غلط موقع مقرر کئے جانے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اس کی موجودگی کے ان دونوں تصورات میں سچائی ہے، اور در اصل ان دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اگر ان دونوں تصورات میں سے ایک بھی نظر انداز کر دیا جائے تو غلطی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کی مدد سے ہم مسیح کی پوری موجودگی کو محسوس کر سکتے ہیں، اور اس خطرے سے بچ سکتے ہیں جس کا اندیشہ ان دونوں تصورات میں سے صرف ایک کو صحیح ماننے سے ہو سکتا ہے۔

ہم صرف ایمان سے اس موجودگی کو محسوس کر سکتے ہیں اور اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایمان اس کی موجودگی کو پیدا نہیں کر سکتا۔ مسیح تو موجود رہتا ہے لیکن اس کی موجودگی ہماری روحوں کے لئے صرف اُس وقت مفید ثابت ہو سکتی ہے جبکہ ہم اُسے ایمان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب مسیح نے اس عورت کو شفا بخشی جس کے بارہ برس سے خون جاری تھا تو اُس وقت اُس کے پاس ہر ایک



مریض کو شفا بخشنے کی طاقت موجود تھی۔ طاقت کو صرف اس عورت نے حاصل کیا جس نے اس کے دامن کو ایمان کے ہاتھ سے چھوا۔ بھیڑ کے لوگ تو اُس پر گرے پڑتے تھے لیکن ان کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس عورت کے ایمان نے نہ تو اس طاقت کو پیدا کیا اور نہ شفا بخشنے پر مجبور کیا بلکہ اس کے ذریعے سے اس نے شفا حاصل کی۔ اسی طرح ہمارا ایمان نہ تو خدا کی موجودگی کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ذریعے ہم خدا کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو ہمیں بلا رکاوٹ دیتا ہے۔ اس کی بخشش ہمارے ایمان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگرچہ بعض معنوں میں اس کا یہ قول سچا ہے کہ "تمہارے اعتقاد کے موافق تمہارے لئے ہو"۔ ہم اپنے تجربے میں دیکھتے ہیں کہ ہمارے چھوٹے ایمان کے عوض میں وہ ہمارے لئے ایسے بڑے کام کرتا ہے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

# باب پانزدہم

## کلیسیائی خدمت

اے قادرِ مطلق خدا سب نعمتوں کے بخشنے والے تو نے اپنے الٰہی انتظام سے
اپنی کلیسیا میں مختلف درجے مقرر کئے ہیں۔ ہم خاکساری سے تیری منت
کرتے ہیں کہ جتنے اس میں کسی عہدے اور خدمت پر مقرر ہونے والے
ہیں۔ انھیں اپنا فضل عنایت کر، اور ان کو اپنے دینِ حق کے علم سے
ایسا معمور کر کہ وہ تیرے بزرگ نام کے جلال اور تیری مقدس کلیسیا
کے فائدے کے لئے تیرے حضور وفاداری سے خدمت بجا لائیں۔
ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے۔ آمین (دعائے عام سے ماخوذ)

ہر سوسائٹی (یا انجمن) میں افسر مقرر کئے جاتے ہیں جن کو تمام کاروبار
سپرد کیا جاتا ہے۔ ہر فوج میں افسر ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں سرکاری وزیر اور
ہر کلب میں منتظم ہوتے ہیں۔ اسی طرح کلیسیا کو بھی خادموں کی ضرورت ہوتی ہے۔
اگر کسی وقت بعض کلیسیاؤں نے اُن کے بغیر کام چلانے کی کوشش بھی کی تو
تھوڑے ہی عرصے میں اُنھیں کسی نہ کسی قسم کے خدمت گزار مقرر کرنے پڑے۔
کلیسیا کی نسبت مقدس پولس جو تصور رکھتا ہے اُس کے مطابق مختلف ممبر





مختلف بخششوں اور کاموں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور ان بخششوں اور
کاموں میں سے ایک کلیسیائی خدمت بھی ہے۔ لیکن ہم یہ غلطی کبھی نہ کریں کہ خادمانِ
دین ہی کو کلیسیا سمجھنے لگیں۔

کلیسیائی خدمت کا ایک اہم کام یہ ہے کہ کلیسیائی اتحاد کو قائم رکھے۔
اس خدمت میں تفریق پیدا ہونا فرقہ بندی کا نشان ہے۔ کیونکہ ہر جگہ اس کے
یکساں ہونے ہی سے کلیسیاؤں کے درمیان جو اَز روئے جغرافیہ ایک دوسرے
سے بڑا فاصلہ رکھتی ہیں، اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم ایک متحدہ
کلیسیا قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ کلیسیائی خدمت کے ایسے
عہدے مقرر کئے جائیں جو کل کلیسیا کو منظور ہوں۔ یہ ایک نہایت دشوار مسئلہ
ہے اور کلیسیائی اتحاد کی تمام بحثوں میں یہ ایک نہایت اہم جگہ اختیار کر لیتا ہے۔
لوزان کانفرنس میں کلیسیائی خدمت کے متعلق پانچ قضیوں پہ اتفاق
قائم کیا گیا۔

۱۔ کلیسیائی خدمت خدا کی بخشش ہے جو مسیح کے وسیلے سے دی جاتی
ہے اور کلیسیا کی بہبودی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

۲۔ کلیسیائی خدمت تا ابد مسیح اور اس کی روح کے حکم سے دی جاتی
ہے اور مؤثر بنائی جاتی ہے۔

۳۔ کلیسیائی خدمت کا یہ مقصد ہے کہ روحانی ہدایت، انجیل کی بشارت
اور سکرامنٹس کے ذریعے سے لوگوں کے لئے نجات اور پاکیزگی کے فوائد
مہیا کرے جو مسیح ہر ایک ایماندار کو دینا چاہتا ہے۔

۴۔ کل کلیسیا یا اس کے ایک حصے کا انتظام اور اس کی روحانی تربیت
کلیسیائی خدمت کے سپرد کی جاتی ہے۔

۵۔ جو لوگ کلیسیائی خدمت کی خداداد قابلیت رکھتے ہیں انھیں روح القدس بُلاتا ہے اور کلیسیا منظور کرتی ہے، اور تقرّر کی رسم سے ان کو کلیسیائی خدمت کے فرائض انجام دینے کا اختیار دیا جاتا ہے۔

ہم خیال رکھیں کہ یہ خدمت کلیسیا کا ایک ضروری عنصر ہے۔ خدا ہی لوگوں کو اس خدمت کے لئے بلاتا اور اختیار بخشتا ہے، اور کلیسیا کو اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے، اور جو بُلائے جاتے ہیں ان پر ہاتھ رکھ کر اس خدمت کے لئے مخصوص کرنا چاہئے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کلیسیا میں اس خدمت کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں، اور بعض کلیسیائیں دوسری کلیسیاؤں کے مدارج کو جائز و درست نہیں سمجھتیں۔ حالانکہ وہ باخوشی وتشکر ان کے باثر ہونے کا اعتراف کرتی ہیں۔ چونکہ اس مسئلہ پر کافی زیادہ بحث ہوتی رہتی ہے، اس لئے ہم کو اس کا مزید مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

عہد نامۂ جدید کی تحریروں میں کلیسیائی خدمت کی ظاہری وضع کی نسبت ہمارے خداوند کی طرف سے کوئی معیّن اور باضابطہ ہدایات نہیں پائی جاتیں۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اس نے بارہ رسول مقرر کئے تھے اور ابتدائی کلیسیا انھیں پر قائم کی گئی تھی۔ (دیکھو اعمال ۲: ۴۲، ۴: ۳۳ تا آخر)۔ اعمال ۱: ۱۵ وغیرہ میں مَتیاہ کے مقرر کئے جانے سے در اصل ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اعمال ۶: ۱-۶ میں اُن "سات" کا مقرر کیا جانا تدبیری کارروائی کا دوسرا قدم تھا۔ ان ساتوں کو اعمال میں کسی جگہ "ڈیکن" نہیں کہا گیا ہے اور وہ اس لئے مقرر کئے جاتے ہیں کہ روپیہ پیسہ کے معاملات کی دیکھ بھال کریں، حالانکہ



وہ وعظ بھی کہا کرتے تھے۔ اس بیان میں یہ قابلِ غور بات ہے کہ مقدس پطرس لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ اپنے میں سے سات شخصوں کو منتخب کریں اور رسول ان کو اس کام کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اُن سات میں سے فلپس بعد میں سامریہ جاتا ہے جہاں وہ نو مُریدوں کو بپتسمہ دیتا ہے۔ لیکن رسول خود آکر ان پر ہاتھ رکھتے ہیں (اعمال ۸: ۱۴-۱۷)۔ رسول اسی قسم کی نگرانی، دوسری جگہوں کے مسیحیوں پر بھی رکھتے تھے۔ مثلاً انطاکیہ میں (دیکھو اعمال ۱۱: ۱۹ وغیرہ)۔ اعمال ۱۳: ۱-۳ میں ہم نبیوں اور معلموں کی بابت اور تبلیغی کام کے لئے برنباس اور پولس کے مخصوص کئے جانے کا بیان پڑھتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کا کلیسیائی خدمت کے لئے مقرر کیا جانا مشکل سے مراد ہو سکتا ہے۔ پھر ۱۴: ۲۳ میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول ہر جگہ کلیسیائی بزرگوں کو مقرر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ کس طریقہ سے مقرر کئے جاتے تھے۔ یروشلم کی کاونسل میں رسول اور بزرگان جمع ہوئے تھے (۱۵-۶)۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب صدر بنایا گیا تھا۔ ۲۰: ۱۷ میں مقدس پولس افسس کے بزرگوں کو بلاتا ہے، اور ۲۸ میں ان کو بشپ (نگہبان) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ فلپیوں کا خط "سب مقدسوں کے نام (یہ لکھا جاتا ہے) جو مسیح یسوع میں ہیں نگہبانوں اور خادموں سمیت" (فلپ ۱: ۱)۔ خطوطِ شبانی میں نگہبانوں، بزرگوں اور خادموں کا ذکر ہے اور اُن کے چناؤ کی ہدایتیں دی گئی ہیں۔

جب ہم ان تمام معلومات کو اکٹھا کرتے ہیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے رسول مقرر کئے گئے تھے، یہ نام ان بارہ شاگردوں کے علاوہ اوروں کو بھی دیا گیا تھا جن کو کلیسیا پر کل اختیار تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقدس پولس کے شبانی خطوط میں تمتھیس اور ططس کو بھی بعض رسولی اختیارات سونپتا ہے

اس کے بعد مقامی حاکم مقرر کئے گئے جو بشپ یا بزرگ کہلائے گئے جو کسی خاص
مقام کی کلیسیا پر اختیار رکھتے تھے۔ اور ڈیکن بھی مقرر کئے گئے جو مالی معاملات
کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ "خدمتِ فضلی" بھی تھی جس میں انبیاء
اور بعض دیگر اشخاص روح القدس کی دی ہوئی خاص بخششوں کو استعمال
کرتے تھے۔ پرسبیٹروں اور ڈیکنوں کے کام سے اس خدمت کا تعلق صحیح
طور سے پہچاننا آسان نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تنظیم شدہ خدمت سے
یہ خدمت کسی قدر علیحدہ تھی۔ حالانکہ اکثر پرسبیٹر اور ڈیکن بھی یقینی طور سے ایسی
خاص بخششیں رکھتے تھے۔ چونکہ یہ خدمت خود مختار تھی۔ اس لئے منظّم خدمت
سے بہت جلد جُدا ہو گئی جس طرح فی زمانہ بھی اکثر غیر پادری اشخاص جو اس
قسم کی بخششیں رکھتے ہیں (مثلاً تعلیم دینا اور مریضوں کو اچھا کرنا) کلیسیا کی
تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، اور کلیسیائی خدمت کے خاص فرائض کے
ادا کئے جانے میں کوئی حصہ نہیں رکھتے۔

رسولوں کے بعد کے ایام نہایت مخفی ہیں۔ کلیمنٹ (Clement)
کے خط سے جو ۹۶ عیسوی میں لکھا گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت
بھی (Bishop-Elders) اور (Deacons) کے دو
طبقے تھے۔ لیکن اگنیشیس (Ignatius) کے خط (۱۱۰-۱۱۷ء) میں
بشپوں، بزرگوں اور ڈیکنوں کے تین طبقوں کا ذکر ہے اور وہ بشپوں
کے ساتھ ایکا رکھ کر کلیسیائی اتحاد کو محفوظ رکھنے کی پُروثوق ہدایت دیتا
ہے۔ اس کے بعد ان تین عہدوں پر چودہ سو سال تک کوئی اعتراض
نہیں ہوا نہ کوئی دوسرا مدِ مقابل طریقِ خدمت قائم کیا گیا۔

عہد نامہ جدید کے وقت کا طریقِ خدمت جس صورت سے اسقفی حکومت



(Episcopal Ministry) میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا جواب
دو طرح سے دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس ان دونوں میں سے کسی ایک کو صحیح
قرار دینے کے کافی ثبوت نہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ رسولوں نے تمتھیس اور طِطُس
جیسے اشخاص اس لئے مقرر کئے کہ وہ رسولوں کے بعض کاموں کو انجام دیں۔
بالخصوص خادمانِ دین کے تقرر کا کام، اور انھوں نے اپنے جانشین بھی مقرر
کئے۔ اس نظریے کے مطابق بشپوں کا تعین کیا جانا اوپر سے ہوتا تھا۔ دوسرا
نظریہ یہ ہے کہ ہر ایک جگہ (Elder-Bishops) کا دبستان
قائم کیا گیا تھا اور ان میں سے ایک لازمی طور پر لیڈر یا صدر بنایا جاتا تھا۔ اس
نظریہ کے مطابق بشپوں کا تعین کیا جانا نیچے سے ہوتا تھا۔ بہرحال تینوں
مدارج ابتدائی کلیسیا میں پائے جاتے تھے اور بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس
کی ہدایت سے یہ نظام قائم کیا گیا تھا۔

ریفارمیشن کے وقت ایک نئی حالت ظہور میں آئی۔ اغلباً ریفارمیشن کے
بہت کم لیڈروں کو حکومتِ اسقفی سے اعتقادی اعتراض تھا۔ لیکن ان میں سے
اکثروں نے دیکھا کہ کلیسیا کی تجدید اندر سے نہیں کی جا سکتی، جس طرح انگلیکن کلیسیا
میں کیا گیا تھا۔ اس لئے انھیں مجبوراً کلیسیا سے باہر جانا پڑا، اور یوں نئے نئے
طریقِ خدمت نمایاں ہونے لگے۔ کالونی (Calvinistic) کلیسیاؤں
نے حکومتِ اسقفی کا نیچے سے نمودار ہونا منظور کیا اور یہ خیال پیش کیا کہ بشپوں
کا اختیار و اقتدار پرسبٹری کے حلقۂ اختیار میں ہونا چاہئے۔ اس لئے انھوں
نے اسقفی نظامِ حکومت کو موقوف کر کے پرسبٹری نظام قائم کیا۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ایک متحدہ کلیسیا کے لئے ایک ایسے متصل نظام
خدمت کی ضرورت ہے جسے کل کلیسیا منظور کرنے پر رضامند ہو۔ لیکن اس وقت

اس قسم کا کوئی نظامِ خدمت نظر نہیں آتا۔ اور بہت لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ
منقسم کلیسیا میں کسی نظامِ خدمت کو پورے طور پر کہا ہی نہیں جا سکتا، تو
بھی زیادہ تر مسیحی اسقف کے تاریخی عہدے کو قبول کرتے ہیں اور اسے
کلیسیا کے تسلسل کا ایک ضروری نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ اگر کوئی کلیسیائی نظامِ حکومت پورے طور سے جائز ہو سکتا ہے تو
وہ اسقفی ہی ہونا چاہیئے۔ تاہم ہمیں دوسرے عناصر کی بھی ضرورت ہے
تاکہ اسقفی نظامِ خدمت کو مکمّل طور پر جائز بنایا جا سکے۔ اس قسم کے عالمگیر
اور عام پسند نظامِ خدمت کا قائم کرنا کلیسیائی اتحاد کا سب سے بڑا اور
پیچیدہ مسئلہ ہے۔

خادم الدین اپنے کام کے لئے تقرّر کی رسم سے مخصوص کیا جاتا ہے۔
جس میں ایک معقول منصب دار کلیسیا کے نمائندے کی حیثیت میں اُس پر
ہاتھ رکھتا ہے۔ خادم الدین کا تقرّر بھی ایک سکرامنٹی فعل ہے اور تمام
سکرامنٹوں کی طرح اس کے وہی تین پہلو ہیں جو اور سکرامنٹس میں پائے
جاتے ہیں۔ اولاً، امیدوار باضابطہ اقرار کرتا ہے کہ وہ واقعی خدا کی طرف
سے کلیسیائی خدمت کے لئے بلایا گیا ہے اور کہ وہ پورے طور پر اپنے آپ
کو اس خدمت کے لئے وقف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دوم، کلیسیا اس
بلاہٹ کا اعتراف کرتی ہے اور اُسے کلیسیائی خدمت کا اختیار دیتی ہے
اور اس کی خدمت پر خدا کی برکت چاہتی ہے۔ سوم۔ سکرامنٹی طور پر خدا
امیدوار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے مزید روحانی بخششیں دی گئی ہیں تاکہ
وہ اپنی خدمت کو لائق طور پر انجام دے سکے اور اُسے الٰہی فضل بھی
دیا جاتا ہے۔



اگرچہ مخصوص شدہ خدمت کلیسیائی زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہے،
ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا کے نام کی گواہی دینا ہر مسیحی کا فرض ہے۔
جس طرح خادم الدین کلیسیا میں اپنے فرائض رکھتا ہے اسی طرح کلیسیا کے
تمام ممبران اپنے فرائض رکھتے ہیں اور کلیسیا کے ممبران خادم الدین کے
حق میں اپنے فرائض ادا نہیں کرتے تو خادم الدین بھی اُن کے حق میں جو فرائض
رکھتا ہے پورے نہیں کر سکتا۔ اکثر، جب لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کلیسیا
کسی خاص کام میں کیوں عملی شوق نہیں رکھتی تو وہ خادمانِ دین کو قصوروار
ٹھہراتے ہیں، حالانکہ خادمانِ دین قصوروار نہیں ہو سکتے جو غالباً اُس کا نہ
تو علم رکھتے ہیں نہ تجربہ رکھتے ہیں۔ بلکہ قصور کلیسیا کے ان ممبروں کا ہوتا ہے
جو اس کام کا علم اور تجربہ رکھتے ہوئے کچھ کوشش نہیں کرتے۔ خواہ ہم
خادم الدین ہوں یا کلیسیا کے عام ممبر ہوں، ہم سب کو اپنے اپنے مقررہ
کام اس کی خاطر پورے کرنے ہیں "جو ہم سے محبّت رکھتا ہے اور جس نے
اپنے خون کے وسیلے سے ہم کو گناہوں سے خلاصی بخشی، اور ہم کو ایک
بادشاہی بھی، اور اپنے خدا اور باپ کے لئے کاہن بھی بنا دیا"
(مکاشفہ ۱: ۵-۶)

# باب شانزدہم

## بائبل (کتابِ مقدّس)

اے قادرِ مطلق اور بکمال رحیم خدا، تونے انسان کے لئے اپنی بڑی محبّت اور اُس کے بچانے کے لئے اپنی قدرت اور ارادہ کا مکاشفہ کتابِ مقدّس میں عطا فرمایا ہے بخش دے، اس کا پڑھنا ہمارے دلوں کی سختی کے سبب بیکار نہ ہو بلکہ اس کے ذریعے ہم توبہ میں مضبوط، اُمیّد میں قائم، خدمت کے لئے مستعد اور سب سے زیادہ تیری اور تیرے بیٹے یسوع مسیح کی حقیقی معرفت سے معمور ہوتے جائیں۔ آمین

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کی پیدائش سے پہلے خدا نے انسان کے لئے ایک ابدی مقصد مقرّر کیا تھا جس کی تکمیل انسانیت کو الوہیت میں قبول کرکے وہ خود کرنے والا تھا۔ بہرکیف اس مقصد کو پورا کرنا محض الٰہی فعل نہیں تھا بلکہ انسان کے تعاون اور ارادہ کی مدد سے پورا ہوسکتا تھا۔ انسان کے ساتھ اپنے ہر برتاؤ میں خدا انسان میں ہوکر اور اس کی مدد سے کام کرتا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتا۔ اسی سبب سے گناہ نے اس مقصد میں رکاوٹ پیدا کردی تھی، حالانکہ





الٰہی مقصد باطل نہ ہوسکا۔ لہٰذا اپنے پُرمحبّت مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے خدا نے انسان کو تعلیم دے کر اسے اس اعلیٰ ترین کام کے لئے تیار کیا جو وہ انسان میں کرنے والا تھا، اور وہ کام تجسّد تھا۔

یہ تیاری بالخصوص ایک خاص قوم کے ذریعے سے کی گئی تھی، جو ساری دنیا کے لئے برکت کا باعث ہونے والی تھی۔ شروع میں یہ قوم کئی باتوں میں اپنے چاروں طرف بسنے والی قوموں کی مانند تھی، نہایت معمولی ابتدائی شروعات سے خدا نے اسے دوسری "قوموں کے لئے نور" بننے کے لئے تیار کیا (یسعیاہ ۴۹: ۶) خدا نے اِس قوم میں ایسے لوگوں کا سلسلہ قائم کیا جو دنیا اور زندگی کے روحانی مطلب کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح پہچان سکتے تھے۔ تاکہ لوگ ان کی مدد سے سچائی کو زیادہ خوبی سے دیکھ سکیں۔ ایسے اشخاص کے خیالات اگرچہ اپنے ہم عصروں ہی کے سے خیالات تھے، اور الٰہی طریقہ عمل میں کوئی ایسا انتظام نہیں تھا کہ جس سے ان کو سائنس یا تواریخ کی حقیقتوں کا خاص علم دیا جاتا، تو بھی اُس نے اُن کو واقعات اور زمانوں کے روحانی مطلب کو اور انسانی زندگی کے مقصد کو زیادہ اچھی طرح پہچاننے کی سمجھ بخشی۔

ان میں سے بعض شخصوں نے حاکم یا مُقنّن بن کر اپنی قوم کی مدد کی۔ اگرچہ ان کے قوانین گردونواح کی قوموں کے قوانین سے ملتے جلتے تھے۔ بلکہ اُن سے مربوط تھے تو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ ان قوانین سے خدا کی نزدیکی حاصل کرسکتے تھے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے قوانین اس زمانہ کی معلومات سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ تاہم وہ قوانین موجودہ زمانہ کے تصوّرات کی بہ نسبت خدا کی مرضی سے زیادہ موافقت رکھتے تھے، اُن میں

دوسرے قسم کے لوگ کاہن تھے جو عہدنامۂ عتیق کے مذہبی رسوم اور قربانیوں کے ذریعے سے خدا کی بابت بہتر تصورات پیش کرتے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس وقت کی دینی رسموں میں اس زمانے کا مکاشفہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے ہم کو اپنے مذہب کی سچائیوں کا اظہار دوسرے طریقوں سے کرنا پڑتا ہے۔ تاہم اس زمانے کے لوگوں نے ان مذہبی رسوم کی مدد سے خدا کی نزدیکی ضرور حاصل کی ہوگی۔ لوگ ان کے باعث خدا کی نزدیکی سے دُور نہیں ہو گئے جس طرح بت پرستی کی بہت سی رسمیں لوگوں کو خدا کی سچی پہچان سے دور کر دیتی ہیں۔

ان سب لوگوں کے ذریعے خدا نے یہودیوں کو اپنے بارے میں بتدریج علم و وقوف بخشا اور اگرچہ یہ سچ ہے کہ اُن کی روحانی بصیرت ادھوری اور نامکمل تھی، کیونکہ بعد میں مقدس پولس خود کہتا ہے کہ "ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوّت ناتمام" (۱-کرنتھیوں ۱۳ : ۹) ہم بھی اس بات کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ عہدنامۂ عتیق میں کل سچائی موجود ہونی چاہئیے۔ بلکہ ان صحیفوں کے لکھنے والے معرفت کی ترقی کی اُمید رکھتے ہیں۔ تاکہ سچّائی کا علم جو انھیں حاصل تھا کامل بن سکے یا جیسا اکثر کہا جاتا ہے، پورا ہو سکے۔ تو بھی رفتہ رفتہ وہ خدا کی بابت زیادہ سیکھتے اور سکھاتے گئے حتیٰ کہ عہدنامۂ عتیق کے پورے ہونے تک یہودی مذہب ایک اعلیٰ اور پُرتاثیر مذہب بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مذہب ناکافی رہا۔ "کیونکہ شریعت نے کسی چیز کو کامل نہیں کیا۔" (عبرانیوں ۷ : ۱۹)۔ عہدنامۂ عتیق خدا اور انسان کی بابت بہت کچھ سکھاتا ہے۔ لیکن انسان اس سے وہ طاقت حاصل نہیں کر سکتا جس سے وہ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کر سکے جو خدا کی مرضی کے



موافق ہو۔

آخرکار وہ تیاری پوری ہوئی اور دنیا خدا کے نئے مکاشفہ کے لئے تیار ہو گئی اور اس نئی زندگی کے لئے جو اس مکاشفہ سے ظاہر ہونے والی تھی۔ اس لئے وقت کے پورے ہونے پر "کلام مجسّم ہوا اور ہمارے درمیان رہا۔" (یوحنّا ۱ : ۱۴)۔ اُس نے انسانی زندگی اختیار کی جو صلیب سے ہو کر قیامت اور صعود میں سمت الرّاس کو پہنچی۔ مسیح میں خدا نے ایک نئی خلقت قائم کی اور انسان کو نئی زندگی اور طاقت بخشی۔ اس نئی زندگی کو ہم اس کے شاگردوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کو رُوح القدس کی بخشش دی گئی تھی جس کی مدد سے وہ انجیل کا پیغام سارے عالم میں سنانے لگے۔

الٰہی مقصد کا اس طرح سے عمل میں لائے جانے کا بیان مقدّس صحیفوں میں پایا جاتا ہے جسے ہم بائیبل کہتے ہیں۔ اُن تحریروں میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ خدا نے کس طرح مختلف اشخاص کے ذریعے سے اپنے آپ کو بتدریج ظاہر کیا اور مسیح میں اپنی ذات کا مکمل مکاشفہ بخشا چنانچہ اگر ہم مسیحی مکاشفہ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بائبل کا مطالعہ ہمیشہ کرتے رہنا چاہئیے کیونکہ اسی سے ہم حقیقی الٰہی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

بائبل کی سچائی اس بنا پر ہے کہ وہ روحانی حقیقتوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ مُسرف بیٹا اور اس کا باپ تواریخی ہستیاں تھے یا نہیں۔ لیکن تمثیل ابویت کی ایک سچّی تصویر ہے۔ چنانچہ جو سوال زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے: "کیا بائبل روحانی سچائیوں سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں"؟ نہ یہ کہ "فلاں بیان جدید سائنس یا تواریخی معلومات سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں"؟ چنانچہ خدا کی ذات کو سمجھنے

کے لئے بائبل کا مطالعہ کرنے سے ہم اپنے تجربہ میں دیکھ سکتے ہیں کہ جس معنی میں بائبل کو سچ ہونا ضروری ہے۔ اس معنی میں وہ واقعی سچ ہے۔

بائبل کو سمجھنے کی کوشش میں کئی مشکل سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا اس کتاب میں جواب پیش کرنا غیر ممکن ہے۔ اگر ہم پہلے ہی سے یہ فیصلہ کرلیں کہ خدا کا طریق عمل کیا ہونا چاہیئے اور پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اس کا واقعی یہی طریق عمل ہو سکتا تو ہمیں یقیناً دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ برخلاف اُس کے ہمیں پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ خدا کس طرح کام کرتا ہے اور بعد میں اس کے متعلق نظریئے مرتب کرنے چاہئیں۔ ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بائبل میں شروع سے آخر تک یہ بیان پایا جاتا ہے کہ خدا انسان میں ہو کر اور اس کے ذریعے سے کام کرتا ہے۔ لیکن اس کی مرضی کو کبھی مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی روح کو اس طرح متاثر کرتا کہ وہ اس کے مقصد کو سمجھ کر اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

# باب ہفدہم

## دُعا

مبارک ساعت دعا کی — جب چھوڑ کے فکریں دنیاوی
میں اپنے باپ کے پاک حضور — سب اُس سے مانگوں جو ضرور
دعا ہے دُکھ اور غم کی آن — تسلی پاتی میری جان
آزمائش سے میں بچتا ہوں — جب دُعا دل سے کرتا ہوں

مسیحی زندگی کا جوہر یہ ہے کہ معتقد ہمیشہ الٰہی صحبت میں قائم رہتا ہے۔ حالانکہ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اس موجودہ زندگی میں خدا کی کامل صحبت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جو شخص الٰہی صحبت میں رہتا ہے اُسی کی زندگی دراصل دعا کی زندگی کہلائی جا سکتی ہے۔ اس لئے دعا کا تصوّر محض دعاؤں کے کہے جانے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری ہوشمند دعائیں جو ہم خاص موقعوں پر کرتے ہیں دعائیہ زندگی کے لئے ضروری تو ہیں لیکن ان کی اہمیت محض اس بات میں ہے کہ ان سے ہماری اندرونی زندگی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی عمدہ مثال خانگی رفاقت ہے۔ خانگی رفاقت کو قائم رکھنے کے لئے محبّت کے کام ضروری ہیں لیکن ان کاموں

کی خاص اہمیت اس بات میں ہے کہ ان سے ہماری خاندانی زندگی کی اندرونی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

پس دعا میں ہم اپنے خیالات، اپنی خواہشات، اپنی خدمات اور اپنے ارادوں کو جن کا تعلق ہماری اندرونی زندگی سے ہے، خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب ہم انھیں چیزوں کو اپنے دوستوں پر ظاہر کرتے ہیں، اور اگر ہمارے دوست لائق ہیں تو اُن کا اثر ہمارے خیالات، خواہشات اور جذبات کو زیادہ پاک اور مضبوط بناتا ہے، اور جو کچھ ہم واقعی کرنا چاہتے ہیں اُسے پورا کرنے کی قوت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم اپنے دلوں کو خدا کے سامنے دعا میں کھولتے ہیں تو ہم اس کی مانند بننے لگتے ہیں اور الٰہی قوت ہماری زندگی میں آنے لگتی ہے۔ ہمارے خداوند کا یہ قول کہ دعا "اس کے نام سے" مانگی جائے، یہی اصلی مطلب رکھتا ہے۔ کسی شخص کا نام اس کی سیرت یا اختیار کا نشان ہے۔ یہ بات ان دو فقروں سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے: "وہ نیک نام رکھتا ہے"۔ یا "بادشاہ کے نام سے"۔ لہٰذا ہماری دعائیں خداوند کے نام سے ہونی چاہئیں۔ یعنی ہمیں اس کے اخلاق اور اختیار کا واسطہ دے کر دعا مانگنی چاہیے۔ غرضیکہ کسی خود غرض دعا کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس کے نام سے ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں ایسا معلوم پڑے کہ حقیقی دعا بالکل غیر ممکن ہے۔ لیکن ہم یاد رکھیں کہ روح القدس میں ہو کر مسیح ہم میں سکونت کرتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اسے اپنے دلوں کا مالک بنا لیں تو وہ ہم میں ہو کر اور ہمارے ذریعے سے خدا سے دعا کرے گا۔ جس طرح وہ دوسرے کام بھی ہم میں ہو کر اور ہمارے ذریعے سے کرتا ہے،



علاوہ ازیں اگرچہ ہمیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ خود غرض طبیعت ہمارے کاموں اور ہماری زندگیوں پر اثر کرتی رہتی ہے۔ روح القدس کا ایک کام یہ ہے کہ وہ ہمارے کسی ہدیہ کو لے کر چاہے وہ کتنا ہی حقیر و ناقص کیوں نہ ہو، اس کی تمام برائیوں کو دور کر کے اُسے اپنی قدرت کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔

ہماری دعائیہ زندگی کی اہم ترین دشواریوں میں سے ایک دشواری یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ دعا میں خدا کی موجودگی کو بہت کم محسوس کرتے ہیں اور اکثر ایسے موقعوں پر بھی جبکہ ہم انتہائی خلوص سے اُس کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس سے بڑے سے بڑے مقدسین کے ایمان کی جانچ ہو چکی ہے۔ مثلاً زبور نویس کہتا ہے "تو اپنا منھ کیوں چھپاتا ہے"۔ (زبور ۴۴: ۲۴)۔ جیسا کہ ہماری کل زندگی میں ہونا چاہیئے ہمیں دعا میں بھی ایمان سے کام لینا چاہیئے نہ کہ بصارت سے، کیونکہ اس سے کوئی چیز زیادہ خطرناک نہیں ہو سکتی کہ مذہب کی بنیاد احساسات پر رکھی جائے۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے خدا خود موقع مقرر کرتا ہے اور اکثر ایسے مواقع اُن لمحات میں آتے ہیں جب کہ ہم کو اُن کی ذرا بھی اُمید نہیں ہوتی۔ لیکن ہم اس کے ظہور کو صرف اس حالت میں حاصل کر سکتے ہیں جبکہ ہم دعا اور ایمان کے ذریعے سے تیار رہتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت خدا کی موجودگی کا احساس نہ دیئے جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہیئے نہ کہ اپنے اوپر۔ ماسوا اس کے ہم نہ تو ہر وقت اس کی موجودگی کی نسبت دیدہ و دانستہ سوچ سکتے ہیں نہ اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔ جب ہم روزمرہ کے عام کاروبار میں مشغول رہتے ہیں تو ہمیں اپنے موجودہ کام پر اپنا دھیان جمائے رکھنا چاہیئے۔ لیکن ان موقعوں میں اس کی موجودگی کا بھی

خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر دعا کے ہر موقع پر ہمیں اس کی موجودگی کا
خاص احساس ہوا کرے تو دوسرے موقعوں پر اس کی موجودگی کو محسوس کرنا
زیادہ مشکل ہوگا۔ اس معاملے میں مختلف لوگوں کے مختلف تجربے ہوتے ہیں۔
کچھ لوگوں پر دوسروں کی بہ نسبت بعض قسم کی "فضائیں" یا "اثرات" زیادہ
اثر کرسکتے ہیں۔ لیکن ہمیں دوسروں کے تجربے میں داخل ہونے کی کوشش
نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ جو تجربہ خدا ہم کو دیتا ہے اسی کو قبول کرنا چاہیئے۔
اور اگر ہم دلیر ہو کر ایمان سے کام لیں تو ہم ناامید نہیں ہوسکتے۔

ایک اور دشواری ہے جسے کبھی نہ کبھی ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ ہم دعائیں
مانگتے ہیں پر کتابِ مقدس کے وعدوں کے موافق ہمیں جواب نہیں ملتا۔ نہ صرف
خود غرض دعاؤں کا جواب نہیں ملتا بلکہ ایسی دعائیں بھی جن کی بابت ہمیں
یقین ہوتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے موافق ہیں بلا جواب رہ جاتی ہیں۔ مثلاً
صلح اور امن کے لئے ہماری پُرخلوص دعاؤں کے باوجود اب تک دنیا میں
امن قائم نہیں ہوا، یا ہماری دعائیں ایک بچے کے لئے بیکار معلوم ہوتی ہیں۔
جو ہماری دعاؤں کے باوجود مر جاتا ہے۔ یا ایک ماں کی دعائیں اپنے بیٹے کے
لئے بے فائدہ معلوم ہوتی ہیں جبکہ لڑکا گناہ سے اپنی زندگی تباہ کر بیٹھتا ہے۔
ان تمام دشواریوں کا جواب پیش کرنا آسان کام نہیں، تو بھی اس مسئلے کو کسی
حد تک حل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اوّلاً ہم یاد رکھیں کہ دعا کوئی جادو
نہیں جس سے ہم خدا کو ہماری مرضی پوری کرنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔ بلکہ دعا سے
ہم ایسی اندرونی حالت اختیار کرتے ہیں جس سے خدا ہم میں اور ہمارے ذریعے
سے اپنی مرضی پوری کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ خدا انسان
کی مرضی کو کبھی مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہماری دعائیں دوسروں



کے دلوں میں خدا کی مرضی پوری کرنے کی خواہش بڑھاتی ہیں۔ اس لئے ہم یقین کریں
کہ صلح کے لئے ہماری دعائیں اس وقت کو نزدیک لاتی جارہی ہیں جب کہ جنگ
اس دنیا سے بالکل موقوف ہوجائے گی۔

ہمارے ایمان کو اس خیال سے اور زیادہ مدد ملتی ہے کہ بڑے سے
بڑے مقدسین کو بھی اس وقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مقدس پولس کہتا
ہے کہ اس نے اپنے "جسم کے کانٹے" کے لئے خداوند سے التجا کی، لیکن اس کی
دعا نہیں قبول ہوئی۔ حالانکہ اس تکلیف کے سبب سے وہ اپنے کام میں رکاوٹ
محسوس کرتا تھا، لیکن خدا نے اُسے اس تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت بخشی
اور اس کی اس طرح مدد کی کہ اس تکلیف کے ذریعے سے اس نے اور بھی زیادہ
بڑی خدمت انجام دی۔ کیونکہ مقدس پولس کی زندگی میں اس تکلیف کو دیکھ کر ہزارہا
لوگ اپنی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی ہمت حاصل کرتے ہیں۔

اس سے زیادہ جاذبِ توجہ ہمارے خداوند کی دعاؤں کا بیان ہے۔
اس کی کئی دعائیں ہم کو نہیں بتائی گئی ہیں۔ اس سے یہ بات اور بھی زیادہ بامعنی
معلوم ہوتی ہے کہ جو دعائیں ہم کو بتائی گئی ہیں اُن میں سے تین پوری نہیں
ہوئیں۔ اُس نے دعا کی تھی کہ مقدس پطرس کا ایمان قائم رہے۔ (لوقا ۲۲:
۳۲) پھر بھی مقدس پطرس نے اس کا انکار کیا۔ اس نے دعا کی تھی کہ کلیسیا میں
اتحاد قائم رہے۔ (یوحنا ۱۷: ۲۱) لیکن ہم اس کی تفرقوں سے بخوبی واقف ہیں۔
اُس نے دعا کی تھی کہ "اگر ہوسکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے" پر اُسے اس پیالے
کو جڑ تک پینا پڑا۔ لیکن جب ہم اس بات پر اور زیادہ غور کرتے ہیں تو ہم سوچ
سکتے ہیں کہ اس کی دعا کا اثر مقدس پطرس کے دل پھرنے پر ضرور پڑا ہوگا۔ فی زمانہ
کلیسیائی اتحاد قائم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں مسیح کی وہ دعا جو اس نے

کلیسیا کے لئے کہی تھی، ایک زبردست طاقت ثابت ہو رہی ہے۔ اور اس دعا کے ذریعے سے جو اس نے گتسمنی کے باغ میں کہی تھی اُس نے ایسی طاقت حاصل کی تھی کہ جس سے کلوری کی اذیت اور ظاہرہ شکست فتح میں تبدیل ہوگئی اور وہ نجات کے کام میں کامیاب ہوگیا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری دعاؤں کے جواب ہمیشہ ہماری توقع کے مطابق نہیں ہوتے اور اکثر اُس حالت میں بھی جب کہ وہ مسیح کی مرضی کے موافق معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ دعائیں جو ظاہراً پوری نہیں ہوتیں بے اثر نہیں ہوسکتیں۔ اگرچہ ہم اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ تاہم اپنے تجربے سے معلوم کر سکتے ہیں کہ دعا ایک ایسی طاقت ہے جسے خدا اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے مقدسین نے دعا کی دشواریوں کی انتہائی حالت کو دیکھا ہے تو بھی اُنھوں نے اس کی عجیب طاقت کو محسوس کیا ہے۔

بلا جواب دعا کی دقت ہمارے خیالات میں اکثر ضرورت سے زیادہ اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ ہمارا مشاہدہ دعا کے متعلق نہایت محدود ہے۔ اگر دعا الٰہی رفاقت کا نشان ہے تو التجا اور شفاعت کو دعا کا ایک چھوٹا حصہ ہونا چاہیئے۔ دعا میں خدا کی آواز پر کان لگانا بولنے کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جب ہم خدا سے آس لگاتے ہیں تو وہ ہماری زندگی کو تبدیل کر دیتا ہے۔ دھیان اور تصور دعا کے دو سب سے بڑے حصے ہیں۔ حالانکہ یہ دعا کے وہ ایسے اجزا ہیں جن سے لوگ غافل رہتے ہیں۔ دعا میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان میں بھی استدعا کا حصہ بہت چھوٹا ہونا چاہیئے۔ اور حمد و شکرگزاری کو زیادہ بڑا حصہ دیا جانا چاہیئے۔ اس فصل کا یہ مقصد نہیں تھا کہ عبادت کے لئے ہدایات پیش کی جائیں۔ لہٰذا بیان کو طول دینے کی کوئی ضرورت



نہیں لیکن ایمان کے کل فائدے حاصل کرنے کے لئے دعا کے جن پہلوؤں کا ذکر اس عبادت میں آیا ہے ان پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔

اس کتاب کے شروع سے آخر تک ہم نے انجیل کے مطلب کو اپنے ذاتی تجربہ میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی "خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کر لیا"۔ ہم نے معلوم کیا کہ اُس میل ملاپ کا مطلب رفاقت کو دوبارہ بحال کرنا اور اس میں گہرائی پیدا کرنا ہے۔ اس رفاقت کا لازمی نشان ایسی زندگی ہے جو از خود باخبر اس کی رفاقت میں گذرے۔ یہی دعا کی زندگی ہے۔

# باب ہشدہم

## تتمہ

اے آسمانی باپ، ہم عاجزی سے تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے کرم کر کے ہم کو اس واسطے بُلایا ہے کہ ہم تیرے فضل کو پہچانیں، اور تجھ پر ایمان لائیں۔ ہماری اس پہچان کو بڑھا اور ہمیں اس ایمان پر ہمیشہ مضبوط رکھ۔ ہم کو اپنا روح القدس بخش تا کہ ہم نئے سرے سے پیدا ہو کر خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے ابدی نجات کے وارث بن جائیں۔ تیرے بندے بنے رہیں اور تیرے وعدوں کو حاصل کریں۔ تیرے اُسی بیٹے ہمارے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے جو تیرے ساتھ اسی روح القدس کی یگانگی میں تا ابد جیتا اور سلطنت کرتا رہے گا۔ آمین

(دعائے عام)

اب ہم اپنے مسیحی تجربے کی آخری منزل پر آ پہنچے ہیں۔ لیکن یہ محسوس کرنا کہ ہم نے اب تک اُسے مشکل سے سمجھنا شروع کیا ہے بالکل سچا ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل میں ہم نے کئی ضروری باتوں کا ذکر بالکل نہیں کیا ہے اور جو کچھ ہم نے معلوم بھی کیا ہے اُسے صرف مزید غور و دھیان کا محض دیباچہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس کتاب کا پڑھنے والا زیادہ مکمل معلومات حاصل کرنے کے





لئے اس سے بڑی کتابوں کا مطالعہ کرے گا اور اس کے علاوہ انجیل کا مطلب اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ جیسے جیسے ہم عہد نامہ جدید کا مطلب زیادہ خوبی سے سمجھتے جائیں گے، اور اُس کام کو جو مسیح ہمارے لئے اور ہم میں ہو کر کرتا ہے زیادہ خوبی سے پہچانتے جائیں گے۔ ہم ان لوگوں کو جن پر ہمارا اثر پڑتا رہتا ہے زیادہ بہتر اور دانشمندانہ امداد پہنچا سکیں گے۔

جب ہم ان مسئلوں پر مزید غور کرتے اور دوسروں کے ساتھ اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں تو ہم کو بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں اور ہم کلیسیائی مباحثوں میں پھنس جاتے ہیں۔ ہم کو ان مباحثوں کے ذریعہ صحیح راستے پر آنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن بیکار بحثوں سے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ فضول کی مذہبی حجت سے ہم روح کے اثر کو آسانی کھو سکتے ہیں، اور یہ خطرناک آزمائش ایسی ہے جو ہر مسیحی پر حملہ آور ہوتی ہے۔ جب ہمیں ایسی بحثوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہم کو سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارا ایمان دراصل ہے کیا، اور یہی اس کتاب کا خاص مقصد ہے۔ اگر ہم اپنے ایمان کی سچائی پر قائم رہیں تو ہم کو تعجب ہوگا کہ روحانی باتوں میں ہم کس قدر گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں، اور جس قدر گہرائی تک پہنچیں گے اسی قدر ہم اصلی سچائی کو خوبی سے پہچان سکیں گے۔ جن باتوں میں ہم دوسروں سے اختلاف رکھتے ہیں، ان میں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا مشاہدہ کیوں فرق معلوم ہوتا ہے اور وہ کون سی روحانی حقیقت دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اکثر ایسے لوگ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بہ نسبت جو ہمارے خیالات سے موافقت رکھتے ہیں ہم کو زیادہ سکھا سکتے ہیں۔

ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ علم بذاتِ خود بے سود ہے۔ بلکہ ہماری روحانی زندگی میں رکاوٹ کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہمارا علم ایسا ہونا چاہیئے جسے ہم اپنی زندگی میں استعمال کر سکیں۔ الٰہی مکاشفہ کو ہم پورے طور پر اسی حالت میں حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ہم اُس روشنی پر چلتے ہیں جو ہمیں بخشی گئی ہے "جب وہ موسیٰ اور نبیوں ہی کی نہیں سنتے تو اگر مُردوں میں سے کوئی جی اٹھے تو اس کی بھی نہ مانیں گے"۔ (لوقا ۱۶: ۳۱)۔ جو شخص خدا کی مرضی پوری کرنے کی خواہش رکھے گا، وہی تعلیم کی بابت جان جائے گا"۔ (یوحنا ۷: ۱۷)۔ علاوہ ازیں علم خدا کے ساتھ ہماری رفاقت کو بڑھا سکتا ہے اور اس کی مرضی کو زیادہ بہتر طریقے سے پوری کرنے میں مدد کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ خدا کے لئے پورے طور سے وقف کر دیا جائے۔

ہم کو ہر وقت اپنا ایمان خدا کے حضور پیش کرتے رہنا چاہیئے اور اس سے دُعا کرنی چاہیئے کہ وہ اُسے قبول کرے اور اس کی خامیوں کی اصلاح کرے، اور ہمیں اپنا فضل بخشے، تاکہ اُس ایمان کے مطابق زندگی بسر کر کے نجات حاصل کر سکیں اور ان لوگوں کی نجات کے باعث بنیں جن کی زندگی پر ہمارا اثر پڑتا ہے۔